کتابی چہرے

سیّد ضمیر جعفری

مَیں شاید یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں سیدضمیرؔ جعفری کو اس وقت سے جانتا ہوں کہ جب ہنوز شاعری کے مرغِ شہرت نے پر و بال نہیں پیدا کئے تھے، مگر ان کو پڑھ کر اور ان سے مل کر میری یہ رائے صحیح رہی کہ ضمیرؔ اور مافی الضمیر میں بُعد ہے نہ افتراق۔ ان کے فکر و ذہن پر ان کے بہت سے دوست لکھیں گے اور خوب لکھیں گے۔ مَیں ضمیرؔ کے بارے میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ سچے انسان ہیں اور انسان دوست بھی۔

ضمیرؔ کے بارے میں یہ کہنا ہر طرح صحیح ہے اور درست کہ اُنھوں نے ادب، صحافت، شعر و سخن اور مزاح ہر محاذ پر عہد آفریں اضافے کئے ہیں، رزم و بزم دونوں کو اپنے خونِ جگر سے لالہ زار بنایا ہے۔

ضمیرؔ جعفری کا ضمیر ہی نہیں دل بھی زندہ ہے اور یہ دل ہی سے کہا گیا ہے،

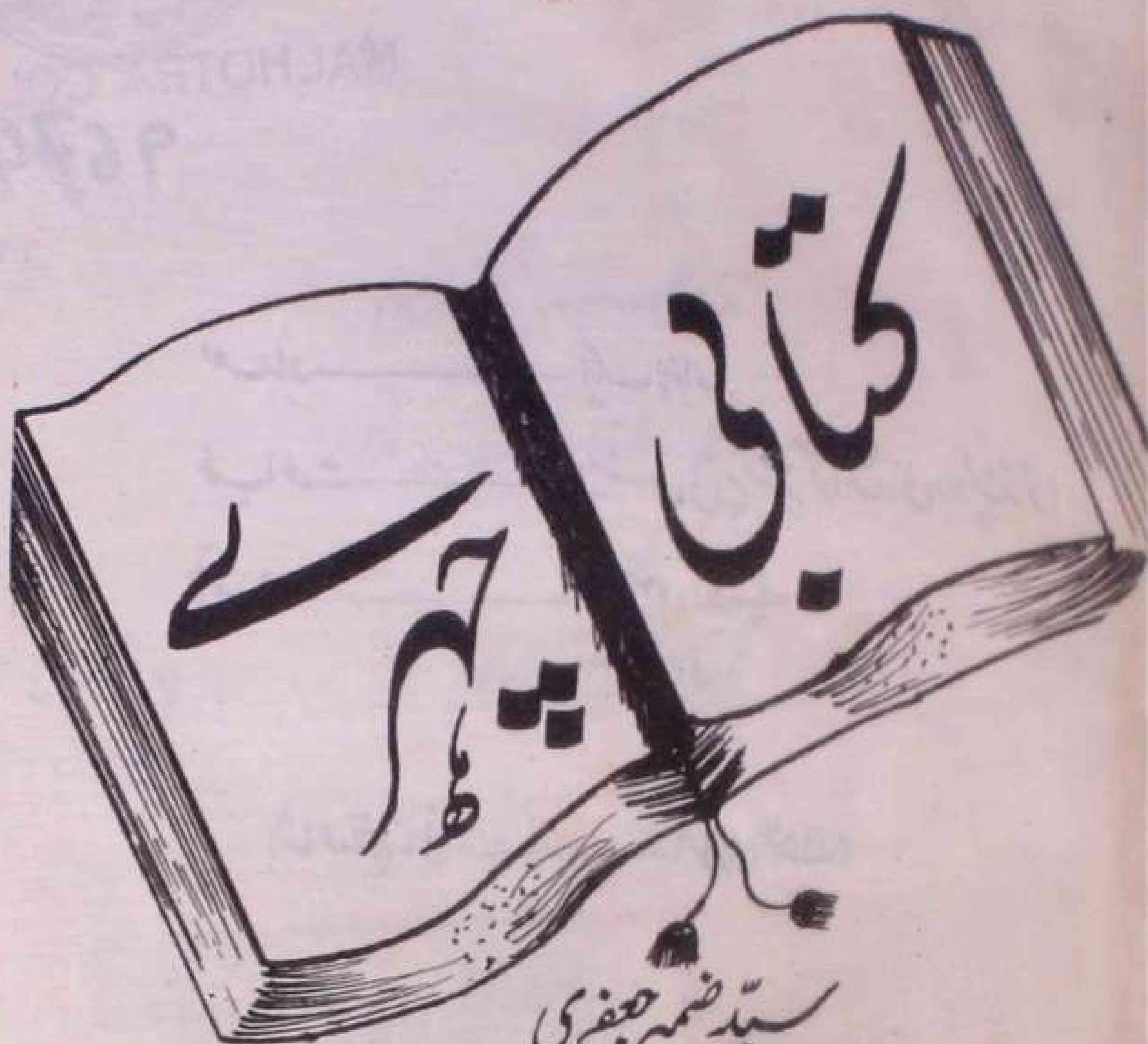
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

ضمیرؔ اپنی حسِ مزاح سے زندگی کی جوت جگاتے ہیں، وہ نظم و نثر میں پھلجھڑیاں چھوٹتے ہیں اور شبِ تیرہ میں چراغاں کرتے ہیں۔

خُدا کرے ضمیرؔ زندہ رہے کہ اس کے بغیر زندگی بے مزہ ہے میری بھی اور قوم کی بھی۔

حکیم محمد سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
ھو



سید ضمیر جعفری

نیرنگِ خیال پبلیکیشنز ایچ/۱/۲۸۰، رشید منزل
کالج روڈ، راولپنڈی

تعداد ـــــــــ ایک ہزار

طباعت ـــــــــ ایس ٹی پرنٹرز گوالمنڈی راولپنڈی

قیمت ـــــــــ ۴۰/- روپے

اشاعتِ ثانی ـــــــــ جنوری ۱۹۸۶ء

ناشر

نیرنگِ خیال پبلیکیشنز

ایچ/۴۰۱، رشید منزل، کالج روڈ، راولپنڈی

فون: ۷۳۴۸۹

نذیر احمد شیخ مرحوم

اے۔ ڈی۔ اظہر مرحوم

اور

ممتاز حسن مرحوم

——— کے نام

تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے

ضمیر

ترتیب

پیش چہرہ

"کتابی چہرے" میرے چند مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً لکھے گئے۔ ان میں تین مضامین پیرو مرشد مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا صلاح الدین احمد اور عبدالعزیز فطرت کی یاد سے منسوب ہیں۔ دوسرے تمام مضامین موجودہ دور کے بعض سرکردہ اہلِ قلم کے اعزاز میں منعقدہ استقبالیوں یا ان کی کسی تصنیف کی "رسم عقیقہ" یعنی کتاب کی تعارفی تقریب میں پڑھے گئے۔ اسی نسبت سے کتاب کا نام "کتابی چہرے" تجویز ہوا۔ اگرچہ کسی مضمون میں چہرہ زیادہ ہے اور کسی میں کتاب۔

ع نے کافرِ مطلق نہ مسلمانِ تمام

یہ سب شخصیتیں، جیسا کہ میں عرض کر چکا، ہمارے دور کی ممتاز ادبی شخصیتیں ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر بھی، ان سب سے نیاز مندانہ، برادرانہ یا دوستانہ روابط کا شرف حاصل ہے۔ اسی لئے، ان مضامین میں ایک سرورِ رفیقانہ کی رو شائد زیادہ اُبھری اُبھری نظر آئے۔ میرا مقصود بھی یہی تھا میرے لئے یہ عمل، احباب کے ساتھ، دسترخوان پر بیٹھ کر، ہنستے بولتے ہوئے، روٹی توڑنے کا پُرلطف عمل تھا...... مجھے معلوم ہے کہ چوٹی کا ایک دوسرا رُخ بھی ہوتا ہے۔ ہاتھی چار پاؤں رکھتے ہوئے بھی ٹھوکر کھاتا ہے۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تنقید تو تنقید ہے، تحسین کا حق بھی، اہلِ کمال کی زندگی میں کماحقہٗ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ان لوگوں کے چہرے پر تو ابھی انجمن کی گرد بھی پڑی ہوئی ہے چنانچہ اس بات کا مجھ سے زیادہ احساس کسی دوسرے شخص کو نہیں ہو سکتا کہ یہ مضامین میری آرزو سے کس قدر کمتر ہیں۔ بادشاہ کا عقاب، کسی کنگلے کے جھونپڑے پر آ کر بیٹھے گا تو یقیناً پر کٹوا کر رہے گا۔ رہا "چوٹی کا دوسرا رُخ" تو جو صاحب اس کا تفصیلی سروے (Survey) کرنا چاہیں چوٹی موجود ہے۔ میں تو اس کے روشن رُخ کو بھی جی بھر کر نہیں دیکھ سکا۔

یہ مضامین اشاعت کی نیت سے نہیں لکھے گئے تھے۔ مگر جب لکھے جا چکے تو جتنی شدید خواہش ان مضامین کو کتابی صورت میں دیکھنے کی میرے دل میں پیدا ہوئی، وہ اپنی کسی دوسری تحریر کے لئے آج تک محسوس نہ ہوئی۔ مگر اس کتاب کی اشاعت پر رُوح میں ایک بڑی ظالم

چُبھن بھی جاگ اُٹھی۔ وہ یہ کہ، ابھی اپنے کتنے ہی ایسے مہربانوں، یاروں، پیاروں، باکمال اور لاجواب لوگوں کا تذکرہ میرے قلم پر قرض پڑا ہے جن کی ذات کو میں نے زندگی کے لئے مسرت و آگہی کا ایک نخلستان ہمیشہ بہار پایا۔ خُدا نے توفیق دی تو مضامین کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

میں اپنی تحریروں کو کتابی صورت میں دیکھ کر خوش تو بہت ہوتا ہوں۔ مگر خود کوئی ایسا اقدام نہیں کرتا، جس سے عملاً کتاب کی اشاعت قریب تر ہو سکے۔ جی چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا آدمی آ کر "چاول" میرے گھٹنے پر رکھ جائے۔ کتاب کے "پروف" پڑھنے سے میری جان جاتی ہے۔ شائد اس لئے کہ اس مرحلے پر بھی، جب اپنی تحریر پڑھتا ہوں تو اندر سے آواز آتی ہے ــــــــــ پڑھتا جا شرماتا جا ــــــــــ مواد تو مواد، عبارت میں بھی ایسی ایسی دراڑیں نظر آتی ہیں، جیسے وہ میری تحریر کردہ نہ ہو، کسی "ٹھیکیدار" کی تعمیر کردہ ہو۔ ایک ایک جُملے کی ٹھوڑی پکڑ کر، بقول مولانا چراغ حسن حسرت، سوچنے لگتا ہوں۔ ؎ یُوں ہوتا تو کیا ہوتا، یُوں ہوتا تو کیا ہوتا

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام میرے دوست اور مُلک کے نامور نوجوان شاعر سُلطان رشک (مدیر، ماہنامہ "نیرنگِ خیال") نے کیا ہے۔ راولپنڈی کی گارڈن کالج روڈ پر واقع "چبارہ نیرنگ خیال" شہر کے ادیبوں اور ادبی سرگرمیوں کے ایک اہم "تکیئے" کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ان کا دفتر "دفتر تصنیفات" سے زیادہ "دفتر تشریفات" معلوم ہوتا ہے۔ رشک کے گھر والے ان کو ــــــــــ "آدھی رات کا سُورج" کہتے ہیں۔ مصروفیت کے اس دریا میں ان کو گردن گردن ڈوبا دیکھ کر جب دیکھتا ہوں کہ انہوں نے اب ایک مکتبہ کی بنیاد بھی رکھ دی ہے تو ڈرتا ہوں کہ کہیں مزید گہرے پانی میں نہ اتر جائیں۔

"یہ کتابی چہرے" کا دوسرا ایڈیشن ہے لہٰذا دوسرا شکریہ مخدومی قمر رعینی کا ادا کرتا ہوں، جنہوں نے پروف کے ساتھ ساتھ متن کی اغلاط بھی درست کر دی ہوں گی۔ یہ شکریہ یا شکریے رسمی نہیں بلکہ میرے دل کی آواز یا آوازیں ہیں۔

سیّد ضمیر جعفری
یکم جنوری ۱۹۸۶ء

سنگاپور کا میجر حسرتؔ

یہ مضمون جون ۱۹۵۵ء میں مولانا چراغ حسن حسرتؔ کی وفات کے بعد جلد ہی لکھا گیا تھا۔ اس کہانی کو میں نے اور میرے عزیز دوست کرنل مسعود احمد (سابق ڈائریکٹر انٹر سروسز پبلک ریلیشنز) نے مل کر لکھا ہے، بلکہ اس کا "نصف بہتر" مسعود ہی کے قلم سے نکلا ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب اتحادی قابض فوجیں ملایا کے ساحل پر اتریں تو مولانا چراغ حسن حسرتؔ اس کے ہراول دستوں میں شامل تھے۔ آپ دو سال سے کچھ اوپر سنگاپور میں مقیم رہے۔

مولانا حسرتؔ جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے شعبہ تعلقاتِ عامہ سے وابستہ تھے۔ اور ہیڈ کوارٹر سے شائع ہونے والے ہندوستانی عسکری اخبارات کی ادارت و نگرانی کا فریضہ ان کے سپرد تھا۔

ہم دونوں (مسعود و ضمیر) ان کے نائب و معاون کی حیثیت میں اس شعبے سے متعلق تھے۔ ہمیں اپنی اس خوش بختی پر بڑا فخر ہے کہ ہمیں زمانے کے ایک صاحب طرز انشا پرداز، ایک بڑے صحافی اور ایک بہت بڑے انسان کو بہت قریب اور بڑی تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جو لوگ اجنبی سرزمینوں میں فاتح لشکروں کی زندگی کا تجربہ رکھتے ہیں، وہ اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں، کہ ہمیں حسرتؔ صاحب سے کتنا اور کیسا تقرب حاصل رہا ہو گا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ زندگی کسی چہرے پر کوئی نقاب باقی نہیں رہنے دیتی۔

ہمارے رفقاء کار میں کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) جاوید خٹک۔ کیپٹن (اب کمانڈر۔) حسن عسکری جو ادبی دنیا میں ابن سعید کے نام سے مشہور رہیں، میجر احمد علی خاں جو آجکل برطانیہ میں پاکستان کے معتمدِ تجارت ہیں۔ کیپٹن انعام قاضی اور کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) رشید حیات پاکستان کے حصے میں آئے، یہ سب دوست وہاں قوم' کے نام سے یاد کیے جاتے تھے اور حسرت اس قوم کے مرشد تھے۔ پھر آگے، قوم' کے بھی اندر مسعود اور ضمیر کو مرشد کا خصوصی قرب حاصل تھا مسعود دفتر میں ان کا نمبر ۲ تھا اور ضمیر دفتر سے باہر ان کا اڈی کانگ!

اس مطالعہ سے اُسی دور کے حسرت کا تذکرہ مقصود تھا۔ چند جھلکیاں، چند باتیں، چند یادیں!

ہمارے لکھنے کا طریقِ کار یہ رہا ہے کہ واقعات کی ترتیب میں —— قربتوں اور فاصلوں کے مطابق، کچھ حصہ مسعود نے لکھا، کچھ ضمیر نے۔ مولانا جہاں ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے قبضے میں چلے گئے، ایک نے قلم روک کر مضمون، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مولانا کو دوسرے کے سپرد کردیا۔

مولانا حسرت کی بے وقت موت ہماری تہذیبی تاریخ کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ یہ ایک فرد کی موت نہیں، ایک روایت، ایک ادارے کی موت ہے۔ ہم نیاز مندوں کے لیے ان کی موت ایک گہرے ذاتی زخم کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی میں کسی کے ساتھ دو قدم چل کر بچھڑ جانے پر قلق ہوتا ہے۔ یہ تو اس دوست کا بچھڑنا ہے، جس کے ساتھ ہم کامل دو برس تک ایک دفتر ہی میں نہیں ایک گھر میں بھی رہے —— یہ تو اس مرشد کی رخصت کا دائمی گھاؤ ہے جس کے قدموں میں بیٹھ کر ہم نے قلم پکڑنا سیکھا ——

یہ تو اس انجمن کے اُجڑ جانے کا ماتم ہے کہ جس کی روشنی ہی کے سبب آج ہم اپنی زندگی کو ایک غیر معمولی متاع سمجھتے ہیں یہ غم تو اب جان کے ساتھ ہی جائے گا، لیکن اس مضمون میں تحریر کے انداز کو ہم نے عمداً ہلکا پھلکا رکھا ہے ہمارا عقیدہ ہے کہ روتے بسورتے

لہجے میں مولانا کی شخصیت سے انصاف کرنا تو کجا، ان کو چھو سکنا بھی ناممکن ہے۔ ہم نے مرشد کے تذکرے کے لیے وہی اسلوب چُنا ہے جو خود ان کا اسلوبِ حیات تھا۔ ہم حسرتؔ صاحب کی پسند و ناپسند سے واقف ہیں، ہم اپنے مرشد کو جانتے ہیں۔ (م۔ ق)

لیجیے اب ضمیر سے سنیے!

مرشد مجھ سے پہلے سنگاپور پہنچ چکے تھے۔ جاوید کے ہمراہ جس وقت میں ہالینڈ پارک کے ایک وسیع، دل کشا بنگلے کے اندر پہنچا تو مرشد ــــــ قوم کے دل میں بیٹھے ہوئے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ میں "شیرازہ"[1] کے زمانے سے ان کا نیازمند تھا دیکھتے ہی کھانا چھوڑ کر مجھ سے پسٹ گئے۔ اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور پھر لنچ کی اسی ایک نشست میں بیٹھے بیٹھے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں۔

"خوب پہنچے ہو میرے بھائی۔ آج رات ظہیر[2] کی سال گرہ کی دعوت ہے۔ مولانا آج ہمیں گا کر پڑھنے والے شاعر کی سخت ضرورت تھی۔ سبحان اللہ لاہور کا بکھرا ہوا شیرازہ کہاں آ کر جمع ہو رہا ہے ــــــ لو چادروں پر بریٹن کی مچھلی بچھا کر کھاؤ۔ یہاں تو بھی کچھ مزا کھانے کو ملے گا میاں! وہ تمہاری یونینیسٹ قسم کی روٹی یہاں کہاں؟"

"وہ جناب قاضی ہیں۔ تم ان کا نام غالباً پہلی مرتبہ سُن رہے ہو مگر مشہور ادیب ہیں ــــــ وہ دھان پان صاحبزادے مولانا عسکری ہیں۔ جاوید کی رائے میں اپنے نامور والد میرزا محمد سعید دہلوی سے بھی بڑے ادیب ہیں ــــــ یہ رشید حیات ہیں، بس رشید حیات المحض و خالص۔ جاوید سے بھی مل چکے ہو۔ آپ جہلم اور فلم سے ہو کر علم کے کوچے میں وارد ہوئے ہیں ــــــ اور یہ مولانا ضمیر جعفری ہیں جہلم کے رہنے والے، جہاں کے لوگ خدا کے تصور کے لیے تھانیدار کو دیکھتے ہیں۔

پھر اس شام ظہیرؔ کی سالگرہ منائی گئی۔ یہ ظہیرؔ سے ان کی بے انداز محبت کی پہلی جھلک

---

[1] مولانا کا فقیدالمثال نگاہی ہفت روزہ "شیرازہ" لاہور [2] مولانا کے صاحبزادے ظہیر الحسن جاوید

تھی جو ہم نے دیکھی۔ مرشد نے جزیرے کے تقریباً سبھی انڈین افسروں کو مدعو کر رکھا تھا۔ دو چار خوش ذوق انگریز جوڑے بھی موجود تھے۔ محفل جمی ـــــ تو مرشد میزبان کی بجائے کچھ اس طرح مہمان بنے بیٹھے رہے جیسے انہیں اپنے سگرٹ کے علاوہ کسی چیز سے کوئی واسطہ نہ ہو ـــــ مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد ـــــ مگر جب بوتلوں کے کاگ اُڑنے لگے تو مرشد نے چہکنا شروع کیا۔ اور اب جو منظر بدلا ہے تو پوری انجمن گویا تنہا حسرتؔ کی ذات سے عبارت تھی۔ میجر احمد علیخان کے الفاظ میں حسرتؔ کا چراغ روشن ہو گیا۔ ان کے لبوں سے شعر و ادب، تاریخ و تصوف، طنز و ظرافت، زندگی اور اس کی چاندنی کا ایک سبک آبشار جاری تھا ـــــ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔

یہ محفل جو مرشد کی اصطلاح میں "بزم بادہ و ہُو" کہلاتی تھی۔ اگلی صبح کے کوئی تین بجے تک جاری رہی یوں کہنا چاہیے کہ مرشد اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ قائم رہے ورنہ تین چوتھائی محفل وہیں کرسیوں پر پاؤں پسار کر سو گئی تھی، مرشد تو وہیں کھڑے کھڑے "صبوحی" تک لگا دینے کا حوصلہ رکھتے تھے مگر نہ معلوم شاید ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ یا شاید جس کسی میں ابھی تک دوسرے کو تھامنے پکڑنے کی سکت باقی تھی وہ ان کو تھام پکڑ کر خواب گاہ میں لے گیا اور یہ محفل بالآخر اس طرح ختم ہوئی کہ اس کو جمتے تو سب نے دیکھا تھا، برخاست ہوتے شاید ہی کسی نے دیکھا۔ نسبتاً ہوشمند لوگوں کو ڈر تھا کہ اگر کل صبح انہیں لوگوں کو دفتر لگانا ہے تو یہ دفتر لگ چکا۔ مرشد کی نسبت سب کو قطعی یقین تھا کہ وہ کل کیا معنی اب ایک پورے ہفتے کے لیے معطل ہو گئے۔ مگر پھر دوسری صبح کو جو پہلی آواز ہالینڈ پارک کے خوبصورت گنبدوں اور روشن غلام گردشوں میں گونجتی ہوئی سنائی دی وہ مرشد کی آواز تھی

"جاوید، عسکری، ضمیر ـــــ قاضی صاحب"

"ارے او ساون کے بادلو"

"ابے او خبلیشو"!

اور بھاگم بھاگ ہم لوگ جب تیار ہو کر ناشتے کے میز پر پہنچے تو وہ پپیتے کے آخری پُرزے کو کانٹے کی نوک پر بٹھا کر خود دفتر جانے کے لیے تیار کھڑے تھے، جہاں سہ پہر تک اب انہیں مسعودؔ کے قبضے میں رہنا تھا، لہٰذا یہ روداد مسعود ہی سے سُنیے۔

مجھے دفتر میں ان کا نمبر ۲ ہونے کا امتیاز حاصل تھا۔ اس سے پہلے میں کلکتہ میں ان کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ مرشد میرے لیے کوئی نئے باس نہ تھے۔ سنگاپور پہنچا تو پہلے ہی روز مجھے پُورے اعتماد میں لیتے ہوئے فرمایا۔

" مولانا آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ اب یہ کام سنبھالیں۔ میں بڈھا آدمی ہوں مجھے اب آرام کرنے دیں۔ میں چاہتا ہوں کچھ پڑھنے کا وقت مل جائے، کچھ گھوم پھر لوں۔ آپ کی تھوڑی بہت مدد کر دیا کروں گا۔"

اس تمام وقفہ میں سگریٹ منہ سے نہیں نکلی۔ دھواں آنکھوں میں جا رہا تھا۔ کبھی کبھی تو یہ گمان ہوتا کہ دھواں آنکھوں میں نہیں جا رہا۔ آنکھوں سے آ رہا ہے۔ درمیان میں جھنجھلا کر آنکھیں ملنے بھی لگتے لیکن آنکھوں کی جلن اور سگریٹ کے دھوئیں میں کوئی رشتہ شاید وہ کبھی دریافت نہ کر سکے علل و معلول کی اکثر کارفرمائیوں سے مرشد عموماً بے تعلق و بے نیاز ہی رہے۔

" ہاں تو مولانا مسعودؔ صاحب بہت اچھا ہوا کہ آپ آ گئے —— لو بھئی چائے اور یہ سگریٹ —— جاوید ماچس —— سنگاپور کو آپ کلکتہ سے زیادہ تقویٰ شِکن پائیں گے۔"

اتنے میں مجھے کپڑا جلنے کی بُو سی آئی۔ میں نے کہا —— " مولانا کہیں کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا؟" —— بولے —— " آپ کہہ رہے ہیں تو ضرور جل رہا ہو گا آپ بڑے خطرناک آدمی ہیں۔" —— پھر ذرا چلا کر بولے —— " ارے قاضی صاحب ذرا ادھر تو تشریف لائیں۔ دیکھیے کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا؟ یہ کہیں سے بُو کیا آ رہی ہے؟"

"اس کہیں سے بُو" کا راز یہ کھُلا کہ جناب کی پتلون کا پائنچہ چار پانچ انچ کے قریب راکھ ہو چکا تھا۔ فرمانے لگے —— "مولانا یہ سگرٹ بھی بڑی واہیات چیز ہے سوچتا ہوں کہ اس لعنت کو چھوڑ دوں۔" —— اور شام تک سگرٹ اور ماچس کے خالی بکسوں سے آدھی ٹوکری بھری پڑی تھی۔

مرشد کی باتیں کرتے ہوئے تسلسل یا اسلوب کا قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خود انہوں نے زندگی کو اسلوب کی بندشوں میں کبھی قید نہ ہونے دیا۔ فوج کے سخت گیر ضوابط بھی انہیں کبھی پابند نہ کر سکے۔ ایک مرتبہ جب افسرِ اعلیٰ نے کسی بات پر بازپُرس کی تو جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا ؎

جرمنی ختم اور اس کے ساتھ جاپانی بھی ختم
تیری کرنیلی بھی ختم اور میری کپتانی بھی ختم

کلکتے کی بات ہے ایک روز دفتر چلے آ رہے ہیں۔ اس شان سے کہ منہ میں سگرٹ ہے فیلڈ سروس ٹوپی بغل میں دبی ہوئی ہے اور کندھوں پہ ایک طرف تین سٹار لگے ہیں اور دوسری طرف دو۔

میرے وہاں پہنچنے پر مُرشد نے مطالعہ کی ایک ذرا سی فرصت اور سیر و سیاحت کی ایک تھوڑی سی مُہلت کے عوض اپنے تمام فرائض مجھے تفویض کر دینے کا فرمان تو جاری کر دیا مگر ہمیں معلوم تھا کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مطالعہ کے لیے مرشد کو مُہلت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جس طرح اور لوگ کتاب پڑھتے ہیں۔ اس طرح ہم نے انہیں پڑھتے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی کیفیت تو کچھ ایسی تھی کہ کتاب اٹھائی۔ اسے چھُوا، ٹٹولا، سونگھا، چند ایک ورق الٹ پلٹ کر دیکھے اور بس۔ اس کے بعد وہ کسی باطنی عمل سے کتاب کا نفسِ مضمون، کتاب کی روح۔ سب کی سب اپنے ذہن میں منتقل کر لیتے، دوسرے روز آپ اس کتاب کے متعلق بات کریں تو وہ اس کے کرداروں کا حسب نسب، کہانی کی اٹھان، اس

کی کمزوریاں اور خوبیاں، مصنف کا اسٹائل اور فلسفہ اور پھر دس اور کتابوں سے اس کی جزئیات کا موازنہ، یہ سب یوں بیان کر جاتے جیسے یہ کتاب انہوں نے مکتب میں سبقاً پڑھی ہو۔

رہی سیر و سیاحت کی فرصت، تو یہ بھی ایک طرح کی آرزو ہی تھی جسے عملی رنگ دینے کا ارادہ مرشد نے غالباً کبھی کیا ہی نہ تھا۔ سچ پچ کی سیر و سیاحت مرشد کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ پھر سیر کے لیے انہیں طول طویل راستے ناپنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ حسن ان کے لیے ایک داخلی کیفیت تھی۔ حسن ان کی آنکھوں اور ان کے دل میں تھا۔ خارجی اسباب کا سہارا اگر انہیں درکار تھا تو نہایت سُبک سا۔ میس کی ایک کھڑکی سے جھانکو تو چھالیہ کے کشیدہ قامت پیڑوں کے جھنڈ آپس میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے تھے۔ دُوسری طرف بالکنی کے باہر چینی چیری کا ایک تناور درخت باہیں پھیلائے کھڑا تھا۔ پُشت کو اُٹھتی ہوئی پہاڑی کی پیشانی پر ایک عرب رئیس کا بنگلہ تھا۔ جس کے زمردیں لان اُوپر سے لڑھکتے پھسلتے ہمارے میس کے حاشیے پر آ کر کہیں رُکتے تھے۔ ذرا ہٹ کر ناریل کے پیڑ ایک دوسرے پر جھکے ہوئے تھے۔ جن کا منظر چاندنی راتوں میں بڑا فسوں خیز ہوتا تھا۔ مرشد فرمایا کرتے۔ چانسری لین کے مناظر جس شخص کے ذوق کی تسکین نہیں کر سکتے اس گدھے کو سارے سوئٹزرلینڈ میں گھما لائیے تو بھی اس کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مطالعہ و سیاحت کی فرصت کی خاطر دفتر کا کاروبار میرے حوالے مرشد کی ایک ادا تھی۔ لیکن اس ادا میں تصنع یا تکلف ہرگز نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت اپنی باتوں پر واقعی یقین کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ دل ہی دل میں انہوں نے بالی کے سفر کا کوئی تفصیلی نقشہ بھی کھینچ رکھا ہو۔ مجھے کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ اس روز مرشد کوئی آدھ گھنٹہ پہلے ہی دفتر سے اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ دوسرے دن صبح کو ناشتے کے میز پر بھی موجود نہیں تھے۔ کمرے میں جھانکا تو دیکھا کہ کرتے پاجامے میں لیٹے "سٹوری آف سان مائیکل میں مستغرق ہیں۔" "سٹوری آف سان مائیکل"

مرشد کی تازہ ترین دریافت تھی۔ فرمایا ــــــ مولانا اس سے بہتر کتاب تو میں نے آج تک نہیں پڑھی۔" لیکن بعد میں ہم اس طرح کے غلو کے عادی ہو گئے۔ مرشد کا انداز ہی یہ تھا ان کے مطالعہ کی کتابیں منتخب تو ہوتی ہی تھیں بس جو کتاب شروع کرتے۔ اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے "سٹوری آف سان مائیکل" سے پہلے ٹالسٹائی کی "وار اینڈ پیس" دنیا کی بہترین کتاب تھی۔ اور اس سے پہلے ہکسلے کی "ایلس ان غازہ"۔

ہم نے پوچھا۔ "آپ دفتر میں تو نہیں تشریف لے جائیں گے"؟ ــــ بولے ــــ مولانا مجھے تو آپ چھٹی ہی دے دیں۔ میں چاہتا ہوں .... مگر ہاں دیکھیے کوئی دس بجے کے قریب جیپ بھیج دیجیے گا۔ ذرا ریفلز لائبریری کا چکر لگا آؤں گا........ ممکن ہے تھوڑی دیر کو دفتر میں بھی آ سکوں"۔

ہمارا دفتر سیسل اسٹریٹ میں ایک عمارت کی بالائی منزل میں تھا۔ سیسل اسٹریٹ کو سنگاپور کی فلیٹ اسٹریٹ کہہ لیجیے۔ اس زمانے میں سنگاپور کے تمام انگریزی اور ملائی روزنامے وہیں سے نکلتے تھے۔ جس جگہ ہم بیٹھتے تھے۔ وہ جنگ سے پہلے ایک ڈچ تجارتی کمپنی کا دفتر تھا۔ جو ملایا سے ربڑ اور مسالے برآمد، اور ڈنمارک سے بیئر درآمد کرتی تھی۔ دفتر کیا تھا۔ ایک وسیع ہال تھا۔ جو کسی زمانے میں پارٹیشنوں سے مزیّن ہو گا۔ مگر جاپانیوں کے چار سالہ تسلط میں ان تکلفات کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ جاپانی جس عمارت میں بسیرا کرتے۔ اس کی کھڑکیاں اور دروازے تک غائب ہو جاتے۔ ساگوان کی بیش بہا الماریوں کو توڑ کر چاول اُبالنے کے لیے چولہا سُلگا لینا ان کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ الغرض ہمارا دفتر بالکل ننگ دھڑنگ قسم کا دفتر تھا۔ جس کے چوبی فرش پر بھاری بھر کم فوجی بُوٹ ہر وقت ایک زلزلہ بپا کیے رکھتے تھے۔ ابھی دس بج کر کچھ منٹ ہی گئے تھے کہ اس زلزلے کی لرزش اور گرج میں ایک نئی شدت پیدا ہو گئی اور ہم سمجھ گئے کہ مرشد تشریف لے آئے موٹی موٹی کتابوں کا ایک "دو بغل بھر پلندہ" ریک میں پھینکا، ٹوپی اُتاری، سگرٹ منہ میں اُڑسی اور

باچھیں کھٹکھٹاتے ہوئے بیٹھ گئے۔ ہم جانتے تھے کہ مرشد اخبار سے جدائی زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکیں گے۔ مرشد کی نظروں میں سب جاہل تھے کوئی ذرا کم، کوئی قدرے زیادہ۔ اخبار وہ ہمارے ہاتھوں میں کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ چنانچہ آتے ہی جائزہ شروع ہو جاتا۔

"مولانا لائیے تو ادھر، یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں ـــــ مولانا یہ کوئی سرخی تو نہ ہوئی، ہمیں تو یہ بتایا گیا تھا کہ خبر کی سُرخی میں جملہ فعلیہ خبریہ ہونا چاہیے ـــــ آپ کو شاید ان سے تعارف نہ ہو لیکن مولانا مُبتدا اور خبر، مضاف اور مضاف الیہ میں ایک بہت قریبی رشتہ ہوتا ہے ـــــ اور ـــــ بھئی محرم علی میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ آپ، صبح کاتبوں کے قلم ضرور دیکھ لیا کریں۔ کل کی سُرخیاں تو ایک دوسرے کو کھانے کو دوڑ رہی تھیں۔

حمید صاحب "نون" کا دائرہ بنانے کی مشق اگر آپ نے لگ کر چار پانچ برس کر لی تو آپ "نون" بنا لیا کریں گے۔ فی الحال تو آپ کا نون فیروز خاں نون کا "نون" معلوم ہوتا ہے۔"

تعریف کے معاملے میں مرشد شقاوت کی حد تک سخت تھے۔ کچھ تو اس لیے کہ دوسروں کو ملتے جانچتے وقت شاید نادانستہ دوسروں کا موازنہ اپنے ساتھ کر جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ موازنہ ان سے ہو تو تعریف کے قابل کون نکلے؟ ـــــ پھر انہیں یہ خیال بھی تھا کہ علم و ادب سے تعلق رکھنے والے آج کل کے نوجوانوں کی بر خود غلطی پہلے ہی تشویشناک صورت اختیار کر چکی ہے انہوں نے تعریف کر دی تو مبادا دماغ ہی خراب ہو جائے۔ وہ حیران ہوتے تھے کہ یہ کیسا دور آ گیا ہے کہ لوگ ابتدائی قواعد کے اصول جانے بغیر عربی و فارسی کی تحصیل کے بغیر، اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیے بغیر، شعر کی تہذیب اور اس کا مزاج سمجھے بغیر مصنف اور شاعر بن بیٹھے ہیں مست قلندر میں ایک افسانہ چھپ گیا، چلو افسانہ نگار بن گئے۔ "پھلجھڑی" نے ایک غزل شائع کر دی، لیجیے شاعر ہو گئے، پھر تحسین باہمی کے حلقے قائم کر کے جہالت کے حصار کو

میں قید ہو کر بیٹھ گئے۔

ایک مرتبہ مجھے بھی مزاحیہ کالم لکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ پہلے روز کالم مُرشد کو دکھایا۔ کالم پر نگاہ جماتے، سگرٹ سے سگرٹ سلگاتے گئے۔ پڑھ چکے تو سگرٹ کے کش کے بیچوں بیچ ایک مبہم سی ــــ "ہونہہ" ــــ کہہ کر کاغذ مجھے دے دیا۔ منہ لٹکائے ہوئے میں واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ دوسرے روز پوچھتے ہیں ــــ "مولانا وہ اپنا کالم آپ نے کیا کیا۔ آج کے اخبار میں تو نہیں ہے۔" میں نے عرض کیا ــــ "پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔" ــــ "فرمایا ــــ ڈے دیتے کیا ہرج تھا۔ اور لغویات بھی تو چھپتی رہتی ہیں" مُرشد کی زبان سے یہ بھی گویا حوصلہ افزائی کے کلمات تھے۔ اس کے بعد کبھی کبھار میں کالم لکھ کر مُرشد کے پاس لے جاتا اور ان سے ــــ "ہونہہ" ــــ وصول ہو جاتی جو کالم کی اشاعت کی اجازت بھی ہوتی۔

ایک روز تو انہوں نے تعریف کی حد ہی کر دی۔ ارشاد ہوا ــــ مولانا اگر آپ محنت کریں تو ممکن ہے ایک روز آپ کو کالم لکھنا آجائے۔ آپ کو یہ بہت بڑا ایڈوانٹیج ہے کہ آپ ان پڑھ ہیں اس لیے آپ فلاں یا فلاں کے اسلوب نقل کرنے کے بجائے خود اپنی سیدھی سادی زبان میں بات کہہ جاتے ہیں یہ تحریر کی بڑی خوبی ہوتی ہے نگارش کی اپنی طرز اسی سے بنتی نکھرتی ہے ــــ ان دو جملوں کے علاوہ مُرشد کے مُنہ سے کبھی اور کوئی توصیفی کلمہ سننا نصیب نہ ہوا۔ اگرچہ پس پُشت وہ اپنے شاگردوں کی تھوڑی بہت تعریف کر دیا کرتے تھے

مُرشد کے ساتھ بات کرنا تلوار کی دھار پر چلنا تھا معمولی سے معمولی غلطی کو اپنے اسلوب طنز کی تازگی کے ساتھ وہ مہینوں تر و تازہ رکھتے یہ ناممکن تھا کہ کسی روز وہ کام سے مطمئن ہو جائیں بالکل کر شاباش دے جائیں معیار کے معاملہ میں وہ قدم قدم پر ابوالکلام آزاد مولانا جالبؔ اور نصیر حسین خیال کا حوالہ دیتے ضمیر کی رائے تھی کہ اگر خود مولانا آزاد مولانا جالب اور نواب نصیر حسین خیالؔ بھی ان کے اسٹاف میں ہوتے تو ان کا مرتب کیا ہوا اخبار مُرشد کے معیار پر شاید ہی پورا

اتر تا مرشد کے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک عجیب سی گھٹن طاری رہتی تھی مگر ان کے جانے کے بعد ہی محسوس ہوا کہ اس گھٹن سے ہم نے کتنا کچھ سیکھا۔ اور ان کی نظر، اپنے پیشے میں ہمارے قد و قامت کو کتنا اونچا لے گئی تھی علم و فن پران کا اپنا انداز طالبعلمانہ تھا۔ اپنے آپ کو انہوں نے کبھی فارغ التحصیل نہیں سمجھا وہ ہمیشہ ہر وقت علم کے اکتساب میں مصروف رہے۔ کہا کرتے اخبار نویسی کرتے پچیس برس ہو گئے ہیں لیکن یہاں فوج میں آ کر اور پبلک ریلیشنز کے اپنے ساتھی انگریز صحافیوں کے کام کو دیکھ کر صحافت کے کئی گُر اب سمجھ میں آئے ہیں"۔ ———— فرینک اون کے آپ بڑے مداح تھے فرینک اون ان دنوں برطانوی فوجوں کے اخبار، "سی آک" کا ایڈیٹر یعنی انگریزوں کا چراغ حسن حسرت تھا۔ آجکل وہ غالباً برطانیہ کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامے کا ایڈیٹر ہے۔

سنگاپور میں "دو الفکیر" کتابوں کی ایک بڑی دوکان تھی۔ جس کے مالک ایک مدراسی مسلمان تھے۔ مدراس میں عبدالفقیر نام عام سننے میں آتا ہے۔ پتہ نہیں "دو الفقیر" ———— عبدالفقیر ہی کا مخفف ہے یا ذوالفقار کی مالا باری شکل۔ مرشد اسی تجسس میں دو ایک مرتبہ اس دوکان پر گئے اور پھر یہ معمول بن گیا کہ دفتر سے واپسی پر وہاں ضرور رُک جاتے سنگاپور کی مرطوب آب وہوا میں ساری دوپہر کام کرنے کے بعد ہمیں گھر جانے کی جلدی ہوتی مگر مرشد ہیں کہ دوکان پر کھڑے ایک شیلف سے دوسرے شیلف اور دوسرے سے تیسرے کی طرف کھچے چلے جا رہے ہیں۔ کتابوں کی دوکان کے اندر جا کر وہ باہر نکلنے کا راستہ ہی بھول جاتے۔ ایک ایک کتاب سے تانک جھانک ہو رہی ہے ادھر ہم دروازے پر کھڑے یا جیپ میں بیٹھے انہیں کوس رہے ہیں۔ بعض اوقات ہم انہیں اتار کر خود چپکے سے فرار ہو جاتے اور جیپ واپس بھیج دیتے۔ مرشد کو اس پر بڑا دکھ ہوتا اس لیے نہیں کہ ہم نے ان کا انتظار کیوں نہ کیا۔ اس لیے کہ ان کے ساتھ اکٹھے رہنے اور کام کرنے کے باوجود ہم اتنے کور ذوق اور بے حس کیوں تھے کہ کتابیں قطار در قطار اور منزل بہ منزل رکھی ہیں مگر ہم میس کیطرف

دوڑ رہے ہیں۔ مرشد کا بس چلتا تو وہ میس کے بجائے دو الفکر یا کتابوں کی کسی دوسری دکان پر بستر لا ڈالتے۔

دفتر سے مرشد کبھی غیر حاضر نہیں ہوئے ویسے ارادہ انھوں نے کئی مرتبہ کیا۔ بعض اوقات محض اس خیال سے کہ یونٹ کا آفیسر کمانڈنگ ہونے کی وجہ سے ان میں اور دوسروں میں آخر فرق ہی کیا ہوا۔ ؟ ان سے آخر کون سوال کر سکے گا۔ کہ آپ دفتر کیوں نہیں آئے؟ مگر پھر دفتر کے بغیر جی بھی نہ لگتا۔ ایک دو گھنٹے کے بعد ٹیلی فون آجاتا کہ جیپ بھیج دو۔ دفتر آئے اور کوئی چیز لکھنے بیٹھ گئے۔ ایک دفعہ اردو کے شاعروں کے تذکروں کا ایک سلسلہ اخبار میں شروع کر دیا اور کسی کتاب یا حوالہ کی مدد لیے بغیر بیسیوں شعراء بھگتا دیے۔ جن شاعروں کا ہم میں سے کسی کو نام بھی یاد نہ تھا، ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات ہی نہیں، بلکہ ان تاریخوں میں اختلافات کی بحث، ان کے کلام کی خصوصیات اور چیدہ چیدہ اشعار یوں قلمبند کرتے چلے جاتے جیسے کہیں سے نقل کر رہے ہوں۔

قلم اور زبان پر مرشد کا جتنا زور چلتا تھا زندگی کے دوسرے مسائل اتنے ہی ان کے قابو سے باہر تھے۔ کسی ارادے کی تکمیل ان سے نہیں ہو سکی ویسے جناب کے ارادے بھی ناقابل عمل ہوتے مثلاً وہی بالی کے سفر کا ارادہ لے لیجیے۔ جس کی طرف سرسری سا اشارہ اوپر آچکا ہے۔ اس زمانے میں بالی کا سفر اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ پکنک پر راولپنڈی سے واہ تک چلے جانا ہے۔ ایئر فورس کے ہوائی جہاز چاروں طرف بھاگے پھرتے تھے۔ اور پبلک ریلیشنز کا نام ہر سفر کے لیے کھل جا سم سم کے معنی رکھتا تھا۔ لیکن مرشد بھلا عوام الناس کی طرح سفر کیوں کرتے ؟ مرشد کے بالی کے سفر کا تصور یہ تھا۔ کہ ضمیر ان کے ساتھ ہو۔ کچھ پیدل، کچھ اکوں پر اور کچھ ٹٹوؤں پر وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں پہنچیں۔ کھانے کا وقت جہاں آجائے پڑاؤ کر کے وہیں چولھا روشن کیا جائے۔ ایک آدمی لکڑیاں چن رہا ہو دوسرا دیگچی مانجھ رہا ہو۔ اور پگڈنڈی کے کنارے مرغی بھونی جا رہی ہو ـــــ اس طرح کا ایک اور شاعرانہ ارادہ ان کا یہ تھا کہ

سنگاپور سے دو چار میل پر ایک چھوٹا سا جزیرہ وہ پٹے پر لے لیں اور باقی زندگی وہاں مطالعہ و تصنیف میں گزار دیں۔ گھنٹوں اس سکیم کا ذکر اذکار رہتا۔ ایک دفعہ میں نے نہایت ہی غیر شاعرانہ سوال کر دیا۔ کہ اس غیر آباد جزیرے میں بسر اوقات کی کیا صورت ہوگی۔ فرمایا ــــــ "بھئی یہ جزیرے تو اللہ تعالےٰ نے جنت کے نمونے پر بنائے ہیں کہ فکرِ روزگار کا وہاں گذر تک نہیں ہے۔ اس مٹی میں آپ دھان کی مٹھی اٹھا کر پھینک دیں اور دوسرے مہینے فصل لپیٹ لیں کھانے کے لیے مرغیاں پال لیے، پھر ناریل ہیں کہ آپ کے لیے اُگل دشربت کے قاب سر پر اٹھائے کھڑے ہیں۔ صبح صبح ایک کشتی میں بیٹھ گئے اور کچھ تازہ بہ تازہ نو بہ نو مچھلی پکڑ لائے۔ مولانا انسان کو اور کیا چاہیے ؟"

مُرشد دراصل اپنی ذات میں ایک وضع اور ایک تہذیب کے سمبل تھے۔ لوگ کہتے ہیں مولانا چراغ حسن حسرت کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ان کا جسد فانی ختم ہو گیا مگر ان کا نام کبھی ختم نہ ہوگا ممکن ہے یہ سب درست ہو لیکن ہمیں اس میں تسلّی کا کوئی سامان نہیں ملتا، حسرت کا نام زندہ رہ سکتا ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں ہمارا مرشد اب یہاں نہیں ہے اور اس کے ساتھ ہی ادب و فن اور تہذیب و وضعداری کا ایک پورا دور تاریخ کے ایک موڑ کے اُدھر اوجھل ہو گیا ہے۔ مرشد ہی نہ رہے تو اب کون ہوگا۔ جو گھنٹوں اس تحقیق میں لگا رہے کہ جوُں جوُں کے بعد توُں توُں کہا جاتا ہے تو کیوں کہا جاتا ہے آج کسی لکھنے والے کی تحریر میں محاورے یا گرامر کی کسی غلطی کی طرف اشارہ کیا جائے تو جواب ملتا ہے کہ جناب میں تو اسے طرح درست سمجھتا ہوں۔ مرشد ذرا سے اشتباہ پر سند کے لیے پریشان ہو جاتے تھے ــــــ "سالک صاحب فلاں محاورے کے متعلق کچھ الجھن سی لاحق ہو رہی ہے۔ کچھ یاد پڑتا ہے کہ منشی دیا شنکر نسیم نے اس محاورے کو اس طرح باندھا ہے مگر اب وہ مقام ذہن سے اُتر گیا ہے۔ آپ کے ذہن میں تو کوئی سند ہو گی ؟" ــــــ لیکن میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا آئیے پھر سنگاپور کی طرف!

دفتر میں مولانا کے چہرے پر خشونت سی طاری رہتی تھی جس کی وجہ سے دفتر کے اوقات

میں اُن سے کھُل کر بات کرنے کی جرأت کوئی نہ کرتا۔ اس وقت وہ حسرت صاحب بلکہ بعض اوقات "سَر" تک ہو جاتے تھے لیکن دفتر سے اٹھتے ہی سب حجابات اُٹھ جاتے اور وہ حسرت صاحب سے اُتر کر مرشد ہو جاتے جیپ کی اگلی نشست پر جناب پھیل جاتے اور پچھلی نشست میں جاوید انعام قاضی، ضمیر اور میں اب فقرے پہ فقرہ چست ہو رہا ہے بات میں سے بات نکل رہی ہے راستے میں اس بے تکلفی سے بولتے کہ سنگاپور کے ٹریفک کے تمام شور و غل کے باوجود پٹڑی پر چلتے ہوئے راہگیران کی بات سن سکتے تھے کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی واقف کار نے کوئی ایسا انکشاف کر دیا۔ جس پہ غصہ، ندامت، تعجب یا کوئی اور مناسب ردِ عمل جو ہوتا وہ تو ہوتا ہی تھا۔ سب سے زیادہ کوفت اس بات پر ہوتی، کہ "قوم" کا یہ قصہ باہر کیسے پہنچ گیا۔ بعد میں پتہ چلتا ——— "ارے بھئی کل جب تمہاری جیپ گذر رہی تھی میں براسبہ روڈ پر "کون واہ" میں کھڑا تصویریں دیکھ رہا تھا کہ حسرت صاحب کی آواز نے چونکا دیا اور پھر جو کچھ وہ فرما رہے تھے اس نے اور بھی ——— الغرض دفتر سے باہر قدم رکھتے ہی مرشد کچھ اور ہو جاتے مگر داستان کا یہ حصّہ ضمیر سے سنیئے کہ وہ اس معاملہ میں ماہرِ "مرشدیات" ہے۔

دفتر میں میرا ان کا واسطہ کچھ ویسے کم تھا، کچھ میں اس واسطے کو اور بھی کم رکھتا تھا اس واسطے سے بس یہ سمجھیے کہ کچھ خوف ہی آتا تھا۔ مرشد جب آواز دیتے، دل دہل جاتا۔ الٰہی خیر! نہ معلوم کمبخت کون سا محاورہ الٹا جا پڑا؟ کس روز مرے کو تکلیف پہنچ گئی؟ کہیں کوئی شتر گربہ تو نہیں پکڑا گیا؟ کسی جملے کی نشست تو برخاست نہیں ہو گئی؟ کوئی بندھنے والا خیال کھل تو نہیں گیا۔ خدا معلوم تذکیر و تانیث کا کون سا شاخسانہ اٹھنے والا ہے؟ ہمیں مرشد کے سامنے اپنی جہالت کے اعتراف و اقرار میں کیا تامل ہو سکتا تھا تاہم نوجوانوں کی پوری معنوی نسل کو اپنے سامنے تختۂ دار پر کھنچتے ہوئے دیکھنے سے کتراتے ضرور تھے۔ ہمیں مُرشد کی ڈانٹ سے زیادہ ان کی مایوسی و آزردگی کا ڈر تھا۔ وُہ گاندھی جی کی طرح دوسروں کو سزا دیتے ہوئے اپنے آپ کو سزا دینے لگتے تھے۔

میں مُرشد کی شاموں اور راتوں کا اردلی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ دونوں کی بہ نسبت اپنی شبوں میں کہیں زیادہ زندہ وتابندہ نظر آتے تھے۔ دن کو تو وہ اکثر ایک نہایت واہیات سے خول میں، جس کو انہوں نے اپنی شخصیت کے اوپر منڈھ رکھا تھا۔ سکڑ کر بیٹھے رہتے۔ بعض اوقات ان کا رویہ نہایت رُوکھی پھیکی سرد مہری سے جا ملتا۔ ہم نے بارہا یہ تماشا دیکھا کہ کوئی ملاقاتی آ کر بیٹھتا ہے۔ مگر مُرشد سگرٹ کا ٹن اس کے سامنے رکھ کر خول میں چھپے بیٹھے ہیں۔ وہ غریب پشیمان ہو کر اٹھنے لگا تو مرشد جیسے چونک کر بولے ——— "ہوں ——— تشریف رکھیے مولانا، آپ سے تو ابھی بہت سی باتیں کرنا ہیں" ——— وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا تو مُرشد پھر غائب۔ دراصل ان کے اپنے اندر اتنا کچھ تھا۔ کہ باہر دیکھنے کی انہیں فرصت تھی نہ خواہش، البتہ شام کو جب آفتاب غروب ہوتا تو یہ آفتاب طلوع ہو جاتا۔ انکی عادت تھی کہ دفتر سے آنے کے بعد کوئی کتاب سینے پر رکھ کر تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے سرِ شام بیدار ہوتے، غسل کرتے، لباس بدلتے، چھٹی کا دن ہوتا تو سرے سے اٹھتے ہی اس وقت تھے یعنی شام ہی کو بناتے۔ ان کے لیے جاگ کر سونا جتنا مشکل تھا، سو کر جاگنا اس سے زیادہ مشکل تھا۔ اور جاگ کر پھر کہیں باہر جانے کے لیے تیار ہونا تو گویا خطرے کا گھر ہونا تھا۔ صاف ستھرا لباس پہننے کا شوق ضرور تھا مگر اس شوق کو اتنی اہمیت بھی نہیں دے رکھی تھی۔ کہ لباس کو پہننا بھی پڑے، سگرٹ، کتاب اور شراب کے علاوہ وہ کسی شے کو بھی کوئی خاص اہمیت نہ دیتے۔ فوجی وردی کی نوک پلک کے بارے میں سخت لاپرواہ تھے۔ مگر چونکہ بڑا اجرنیلی قد کاٹھ پایا تھا اس لیے جو چیز جس طرح پہن لیتے، سج جاتی۔ وہ تیار ہوتے نہیں تیار کرائے جاتے تھے۔ ان کا "بیٹ مین" عنایت اللہ جس کو وہ علامہ کہتے تھے، بیگم حسرت پر تحسین و آفرین بھیجتے ہوئے اکثر کہا کرتا تھا ——— "میں تو صاحب کو بچوں کی طرح پال رہا ہوں"

مرشد تیار ہو کر بیٹھتے تو پوری 'قوم' ان کے کمرے میں جمع ہو جاتی۔ میس سے ملحق بڑی اعلیٰ نشست گاہ موجود تھی۔ لیکن وہاں جا کر بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ

اگر مُرشد کا بس ہوتا تو وہ کھانا بھی اسی میز پر کھلتے جس پر سمرسٹ ماہم، جیمز جوئس، عذرا پاؤنڈ اور بالزاک وغیرہ کے دوش بہ دوش حجامت کا سامان، عینک اور گھڑی، سگرٹ اور ماچس، قلم اور کاغذ معدے کے انگریزی چورن، موزے اور چھوٹی موٹی درجنوں دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ "محفل نورانیاں" اسی میز کے گرد جمتی۔ مرشد اس وقت اپنے آپ کو خول سے نکال کر گویا میز پر رکھ دیتے اس وقت ان کے چہرے کی شگفتگی اور گھنی گنجان مونچھوں میں سے پھوٹ کر کان کی لوؤں تک پھیلتی ہوئی ایک دلآویز مسکراہٹ دیکھنے کی چیز ہوتی۔ شام ہوئی اور مُرشد نے اپنا مخصوص نعرہ مستانہ بلند کیا —— "ذرا خاں صاحب کو آواز دینا"۔ یہ خاں صاحب پوری یونٹ کے کوارٹر ماسٹر تھے۔ جو عملاً مرشد ہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ بے چارے صبح سے اس آواز کے منتظر ہوتے اور آواز سنتے ہی میز کو کارگاہ شیشہ گراں بنا کر رکھ دیتے۔ مرشد کی "محفل شبینہ" کی پہلی مجلس ڈنر تک جاری رہتی اور ڈنر وہ گیارہ بجے سے پہلے شاذ ہی کھاتے۔ یہ "محفل شبینہ" —— "ذرا خاں صاحب کو آواز دینا" —— سے شروع ہو کر عموماً اس مقام پر ختم ہوتی جہاں یا تو حلق سے کوئی آواز نکل ہی نہ سکتی یا لوگ اپنے آپ کو آوازیں دینے لگتے۔ مرشد کو اپنے دور کے کسی شاعر کا کوئی شعر شاید ہی یاد ہو مگر اساتذہ قدیم کے بے شمار اشعار سینے میں محفوظ تھے۔ بالعموم وہ داغ سے شروع ہوتے پھر جُوں جُوں کیف بڑھتا جاتا توں توں غالب و بیدل سے ہوتے ہوئے عرفی و نظیری، سعدی و حافظ کی طرف اوپر ہی اوپر پڑھتے جاتے۔ دوسروں کے شعر پڑھنے میں انہیں جتنی راحت ہوتی، اپنے شعر سنانے میں اتنی ہی وحشت ہوتی، ہم اصرار کرتے تو لاحول پڑھ کر ٹال دیتے لیکن محفل شبینہ کے آخری رسیلے لمحات میں ہتھیار ڈال دیتے اور پھر ایک نہایت پرسوز، کھوئے کھوئے، ڈوبتے ابھرتے ترنم کے ساتھ، جس میں ماورائے سخن بھی ایک بات ہوتی۔ ڈھائی تین تین شعروں کی دو چار غزلیں سنا دیتے۔ اُن کی مشہور غزل —— "آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں ——" ہمارا قومی ترانہ تھی جس کے بعد مرشد حسنِ یار کی

باتوں سے آگے نکل کر خود "آستانِ یار" کی طرف چل پڑتے ہاؤ و ہو کی یہ محفلیں، مرشد کے کلاسیکی مذاقِ ادب، ان کے وسیع معلومات، دل نشیں ظرافت، شستہ و برجستہ بذلہ سنجی اور برمحل اعلیٰ اشعار کی ترشح کے باعث ایک سدابہار و بستانِ علم و دانش کا درجہ رکھتی تھیں باتوں باتوں میں ہم وہ کچھ سیکھ جاتے جو برسوں کے باقاعدہ اکتساب سے بھی شاید ہی سیکھ سکتے" بحث کے معاملے میں ان کا معاملہ یہ تھا کہ ـــــ اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے ـــــ چنانچہ انہیں چھیڑنے کے لیے ہم کوئی غلط نظریہ کوئی متنازعہ فیہ محاورہ، کوئی بھونڈا اسلوب بیان شیرشاہ سوری کا غلط سال جلوس، شبلی کے ماخذات، سیماب اکبرآبادی کا کوئی شعر، ـــــ غرضیکہ کوئی سی بات مصرعِ طرح بنا کر چھوڑ دیتے اور مرشد مشرق و مغرب کی وسعتیں سمیٹ کر دیکھتے دیکھتے معلومات کا ایک قطب مینار کھڑا کر دیتے کسی لفظ کی صحت کے درپے ہوگئے تو اردو، فارسی اساتذہ کے یکمشت پندرہ بیس اشعار گویا ایک دوسرے سے بندھے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ قدیم اساتذہ میں سے وہ خدا معلوم کہاں کہاں سے ایسے ایسے گمنام لیکن جید شعراء کو ڈھونڈ نکالتے جن کو جاننا ادب کو جاننے کے لیے لازمی ہے مگر جانتا کوئی نہیں۔ اردو شاعری میں وہ حسرت موہانی اور اقبال کے بعد کسی شاعر سے کوئی سروکار نہ رکھتے۔ جن شعرا کا کلام نظر سے گزرتا تھا یا جن کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ مرشد نے ان کو صرف دو درجوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سوجھ بوجھ کا شاعر اور بکواس ـــــ کسی لفظ کے حسب نسب کا مسئلہ درپیش ہے تو چراغ لے کر مصر دیونان کے اندھیروں میں اتر جاتے اور عرب و عجم، افغانستان و کشمیر سے ہوتے ہوئے جب مراجعت فرماتے تو ترکی الاصل، عربی النسل، ایرانی نژاد ـــــ اور خانہ زاد الفاظ کے الگ الگ جلوس ان کے ہم رکاب ہوتے ـــــ تاریخ پر عبور کا یہ عالم کہ غیاث الدین بلبن کے رکاب دار دل کے نام مع سن ولادت و وفات گن لیجیے۔ سکندرِ اعظم مقدونیہ سے چل کر جن جن راستوں سے ہوتا ہوا بیاس تک پہنچا تھا۔ مرشد ان راستوں کے پتھر پتھر سے واقف تھے ـــــ اسلام کے تہذیبی، معاشرتی اثرات پر ان کی نظر اتنی گہری تھی کہ صدیوں کی

دھوپ چھاؤں کے ایک ایک سائے کو علیحدہ علیحدہ کر کے دکھا دیتے۔ دوسری طرف پراچین ہندو دیو مالائیں بھی گویا گھر کی لونڈی تھیں۔ افسانوی دیوی دیوتاؤں کے باہمی رشتوں ناطوں جھگڑوں آویزشوں سے پورے پورے باخبر، علم طب سے اتنا گہرا شغف کہ اگر وہ ادب کے بجائے طب میں جا پڑتے تو شاید زیادہ آسودہ رہتے۔ مزے کی بات یہ کہ فلسفہ ہو یا فلکیات، بات اس قدر سلجھا کر بیان کرتے کہ مولانا صلاح الدین احمد کے الفاظ میں "موضوع کو پانی کر کے چھوڑتے" تاریخ ان کا خاص مضمون تھا۔ مرشد جو کچھ بولتے تاریخ معلوم ہوتا۔ جو کچھ لکھتے تاریخ بن جاتا۔

مرشد موج میں ہوتے تو نکتہ طرازی و انجمن سازی کے لیے کوئی غلط بات کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی اس کیفیت میں وہ صحیح بات کے بھی پرزے اُڑا دیتے۔ بالخصوص جہاں ذاتی پسند یا رائے کی گنجائش ہوتی مثلاً اگر آپ گاندھی جی کی عظمت بیان کر رہے ہیں تو مرشد بندوق کی نالی گاندھی جی کی طرف سیدھی کر دیتے اگر آپ گاندھی جی کی مذمت کر رہے ہیں تو مرشد اپنے ترکش کے سارے تیر لے کر گاندھی جی کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتے۔ اصلیت جہاں تک میں سمجھ چکا ہوں، یہ تھی کہ ایک عظیم جینئیس ہونے کی وجہ سے ان کی اپنی انا کا جذبہ بڑا قوی تھا۔ وہ بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہونے کو تیار نہ تھے۔ چھوٹوں کے سامنے وہ جس عاجزی سے بچھ جاتے تھے بڑوں کے سامنے اتنے ہی سرکش نظر آتے، لیکن پھر چند شخصیتیں ایسی بھی تھیں جن کے سامنے ان کی گردن ہر وقت جھکی ہوئی ملی۔ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف وہ ایک لفظ بھی نہ سن سکتے۔

دوستوں کی محبت ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ۔ سب سے بڑی تسکین تھی مگر دوستی کرنے میں وہ تقدم یا تیزی کے قائل نہ تھے، مدت تک یہی نہ کھل سکتا کہ وہ دوستی پر آمادہ بھی ہیں یا نہیں لیکن اندر ہی اندر نامعلوم طور پر وہ دوسرے کے دل میں سما جاتے اور پھر دوستی میں ان کی بے بسی یہاں تک پہنچ جاتی کہ دوست اگر دشمن بھی ہو جا

تو وہ اسے چھوڑ نہ سکتے۔ عالی ظرفی کا یہ حال تھا کہ وہ سالک صاحب کی سب سے بڑی عزت ہی اس لیے کرتے تھے کہ سالک صاحب فن میں ان کے سب سے بڑے حریف تھے۔ احمد شاہ بخاری، مجید ملک، مولانا صلاح الدین، صوفی تبسم، تاثیر، عابد، فیض، تاج کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت اور شیفتگی کے ساتھ کرتے اور ہندوستان بھر میں بہت کم لوگوں کو ان کے پلے کا آدمی سمجھتے۔ نیاز مندوں کی ادبی خامیوں پر اندر خانے خواہ ان غریبوں کو کھا جاتے مگر بیرونی معرکوں میں مرشد کا طاقتور قلم ان کی ڈھال بن جاتا۔ اپنے ساتھ بیدل نظیری، لاہوری تقانی وغیرہ کو بھی دوست کی کمک پر لے آتے۔ دوستوں سے وہ کمزوری کی حد تک محبت کرتے تھے افراد و اقدار کے بارے میں اُن کے جمے ہوئے نظریات و تعصبات اتنے بھاری پتھر تھے کہ کوئی دوسرا تو کیا، ان چٹانوں کو وہ خود بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکتے تھے۔ سنگاپور میں وہ اپنے لاہور کے بعض ایسے جگری دوستوں کا تذکرہ اکثر بڑے فخر کے ساتھ کرتے تھے جن میں سے ایک دودھ دہی کی دوکان کرتا تھا۔ ایک لوہے کے ٹکے ٹکیاں بیچتا تھا۔ اور ایک حسرت صاحب سے دوستی کے علاوہ بہرے سے کوئی کام ہی نہ کرتا تھا۔ وہ جب ان کی بے غرض محبت، بے ریا خلوص۔ بے لوث وابستگی میں اپنے حسن بیان کا جادو جگاتے تو یوں معلوم ہوتا کہ یہ لوگ جیسے ناولوں کے ہیرو تھے جو کتابوں سے نکل کر لاہور کے گلی کوچوں میں چلے آئے ہوں۔ بعض اوقات مرشد عشرت و آسودگی کے اس ماحول میں جو وہاں انہیں میسر تھا۔ ان دوستوں کی یاد میں تڑپ اٹھتے، مغموم ہو جاتے اور ملازمت ترک کر دینے کے منصوبے سوچنے لگتے۔ آخر ایک عزیز دوست ریاض شمیم (اب لیفٹیننٹ کرنل[1]) جب اتفاقاً تبدیل ہو کر سنگاپور آ گئے۔ تو مرشد اس قدر خوش ہوئے کہ اس طرح بے تحاشا خوش ہوتے ہم نے انہیں کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہفتوں بھر ملنے والوں سے ریاض ہی کا تذکرہ چلتا رہا۔

"مولانا سُنا آپ نے۔ ریاض شمیم بھی یہیں آ گئے۔"

---

[1] میجر جنرل ہو کر ریٹائر ہوئے

"یہیں دہلی میں تھا کہ وہ دانا پورے بدل کر دہلی آگیا۔ پھر کلکتے اور اب میرے پیچھے پیچھے یہاں بھی"

"آپ ریاض شمیم سے ملے ہیں ـــــــ ضرور ملیے گا ـــــــ حسین بھی ہے ذہین بھی ہے۔"

ان کا سینہ یقیناً آرزوؤں اور ارادوں کا تلاطم زار ہو گا۔ مگر وہ اپنی آرزوؤں، محرومیوں کی کتھا سے دوسروں کو کبھی مکدر نہ کرتے۔ زندگی کے ہر روپ کو ایک انعام، ایک فیضان سمجھتے جن دو ایک آرزوؤں کی بآواز بلند پرورش کیا کرتے۔ ان میں سے ایک سلسلہ دار آرزو یہ تھی کہ دریا کے کنارے ایک معقول سا گھر ہو۔ ڈھنگ کی لائبریری ہو، جس میں بیٹھ کر وہ سمرنا سے بغداد، بغداد سے سمرنا تک کی تاریخ لکھتے رہیں۔ اور چند یار جانی ہوں۔ جن کے ساتھ شام کو ہاؤ و ہو ہوتی رہے۔ غالباً یہ تنہا آرزو ہے جس کی تکمیل کے لیے انہوں نے عملی اقدام بھی کیا۔ پونچھ میں دریا کے کنارے ایک مکان بنوا لیا تھا، کتابوں کا خاصہ ذخیرہ جمع کر لیا تھا مگر افسوس کہ حالات اور زندگی نے انہیں وہ کام نہ کرنے دیا جو صرف وہی کر سکتے تھے۔

لاہور شہر اور اس کی زندگی سے مرشد کو عشق تھا ـــــــ سنگاپور کہ جنوب مشرقی ایشیا کا پیرس سمجھا جاتا ہے۔ بڑا ہی جمیل و تابناک شہر ہے۔ جنگ کے بعد فتح کی مسرتوں نے ان دنوں اس کو کچھ اور زیادہ پیرس بنا رکھا تھا۔ شراب وافر، وقت اپنا۔ غالب نے جو بات آم کے بارے میں کہی ہے وہی بات اس خطے کے زہرہ شمائلوں پہ صادق تھی کہ عام بھی تھے اور شیریں بھی۔ آباد میخانے، شاداب رقص گاہیں، خوابگوں ساحل گاتے ہوئے کیبرے، جگمگاتے ہوئے کلب، معمور ریستوران، ہیپی ورلڈ گریٹ ورلڈ کے طرب خانے، آزادی، فرصت، فراغت، مرشد کو اور کیا چاہیے تھا؟ انہیں اس شہر سے یک گونہ لگاؤ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ سنگاپور نے انہیں زندگی کے دو ایسے بہترین اور عہد آفرین سال دیے تھے کہ ہر برس کے تھے دن پچاس ہزار، مگر اس کے باوجود سوادِ رومۃ الکبریٰ میں انہیں اپنی دلی

یعنی لاہور کی یاد ہمیشہ تڑپاتی رہی۔ میں ہر وقت سائے کی طرح ان کے ساتھ لگا رہا ہوں مجھے ایسا کوئی لمحہ یاد نہیں۔ جب وہ لاہور کی یاد سے غافل ہوئے ہوں۔

"مولانا یہ شہر بکواس ہے۔"

"مولانا اس شہر کی اپنی کوئی شخصیت نہیں"

"مولانا سنگاپور کو آپ اٹھا کر فرانس میں بھی رکھ سکتے ہیں" اور لاہور کے فضائل میں

"مولانا، لاہور بجلی کا بٹن دبانے سے نہیں بن گیا"

"مولانا، لاہور ایک تہذیب، ایک وضع کا نام ہے۔"

"مولانا، لاہور، لاہور ہے۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک دعوت میں مرشد ایک میجر سیٹھی سے اتنی سی بات پر سچ مچ لڑ پڑے تھے کہ سیٹھی کے والد لاہور کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ جا بسے تھے۔

مرشد کی رند مشربی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ نہ اتنی معمولی چیز ہے کہ میرے چھپائے چھپ سکے وہ خرابی کے پورے معنوں میں رند خرابات تھے۔ انہیں سگریٹ، کتاب شراب سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ انہیں اس طرح دیکھنا غلط بھی ہوگا۔ پینے کے معاملے میں وہ شاعری کے روایتی بلانوش کی طرح دریا سمیٹ کر پی جاتے تھے۔ جتنی پیتے جاتے حواس اتنے ہی روشن ہوتے جاتے۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ اُن کے بہکنے کا آسانی سے پتہ بھی تو نہ چل سکتا تھا۔ آنکھیں عموماً ویسے ہی سُرخ دست رہتی تھیں پائے وہ یوں کب جاتے تھے کہ کھوئے جانے کا سراغ مل سکے اگر کوئی ٹوکتا کہ مولانا آپ شاید بہک گئے ہیں تو جواب ملتا ——— مولانا آپ بہک گئے ہیں۔ میرا تو سر دامن بھی ابھی تر نہیں ہوا۔ پھر ہوشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے تین چار ساغر پے در پے خالی کر جاتے، ان کا بہکنا اگر کچھ تھا بھی تو ایک نہایت معصوم سا، بڑا علمی قسم کا بہکنا تھا۔ طنز نوکیلا ہو جاتا، لطیفے بھرپور ہو جاتے اشعار کی روانی طغیانی پر آجاتی۔ معصیت و بخشش کے مضامین زور باندھ دیتے۔ جن اشعار کو وہ پہلے پینے

کاعنوان بنا تے تھے۔ انہیں اشعار کو بعد میں رونے کا سامان بنا لیتے۔ ہم نے اپنی سہولت کے لیے یہ علامت مقرر کر چھوڑی تھی کہ مرشد جس وقت لاہور یا سالک صاحب کے موضوع پر بلا وجہ ہی دوسروں سے اُلجھنے لگیں تو یہ سمجھیے کہ وہ بہک گئے۔ اس مرحلہ پر وہ خان صاحب کو بلند آوازیں دیتے خان صاحب قریب نہ پھٹکتے۔

مرشد ہر شام کو جس فراوانی سے پیتے، جس باقاعدگی سے رات کو "شگفتن گلہائے ناز" کی سیر کو نکلتے اور پھر جس یکسوئی کے ساتھ ان نظاروں میں اُلجھ کر رہ جاتے، اس کے بعد ان سے یہ توقع رکھنا کہ انہیں اپنے گھربار، بیوی بچے کا بھی کچھ خیال ہوگا۔ ایک زیادتی کی بات تھی۔ بظاہر اُن کی وارفتگی سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ ؎

دِل میں ذوقِ وصل یاد یار تک باقی نہیں

لیکن یہ سب قیاس ہی قیاس تھا۔ مرشد کی شخصیت کا سب سے حیرت انگیز پہلو یہی ہے کہ وہ اندر ہی اندر ایک نہایت سجے ہوئے گھریلو قسم کے انسان تھے۔ بڑے شفیق باپ، نہایت رقیق القلب شوہر، اپنی ساری ماورائیت کے باوصف ان کا دل ہر وقت لاہور یا پونچھ میں اپنے بیوی بچے کے ساتھ دھڑکتا رہتا تھا ـــــ گھر سے خط آنے میں دو روز کی تاخیر ہو جاتی تو پریشان ہو جاتے جوابی تاروں کا سلسلہ باندھ دیتے۔

بازار کی خرید و فروخت سے انہیں سخت وحشت ہوتی تھی۔ اُن کی ضرورت کی اکثر چیزیں ہمیں لوگ خریدا کرتے۔ مگر جب کبھی خود بازار میں نکلتے تو ظہیر و زینب کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی تحفہ خرید لیتے۔ ظہیر کو اتنے لمبے لمبے اور پیارے پیارے خط لکھتے کہ اگر اتنا وقت مستقل تصنیف کی طرف دیا ہوتا تو وہ "بغداد سے سرنا" تک والی تاریخ لکھ ڈالتے ـــــ ایک مرتبہ آپ وہاں ذرا ایک ـــــ باقاعدہ عشق میں مُبتلا ہو کر عقدِ ثانی پر آمادہ ہو گئے بیعونہ بھی ہو گئی رہی سینکڑوں ڈالر کے تحائف لڑکی والوں کی نذر کر دیئے۔ مگر جب عقد کی ساعت قریب آئی تو ظہیر یاد آگیا ـــــ زینب یاد آگئی ـــــ پونچھ یاد آگیا ـــــ اور آخر شِپ اپنے

ہونے والے معزز خسر کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ مولانا مجھے معاف کر دو —— مجھ پر لعنت بھیجو۔ مجھے بھول جاؤ!

مرشد کی گشتِ شبینہ کا انداز بھی کچھ اپنا ہی تھا، مغربی موسیقی سے انہیں ہول آتا تھا فلم دیکھنے کو وہ تضیع اوقات سمجھتے۔ البتہ چینی، ملائی، انڈونیشی اوپیرا ذوق و شوق سے دیکھتے۔ لیکن کسی ایک مقام پر دیر تک بیٹھے رہنا ان کے لیے قریب قریب ناممکن تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ کسی ابتدائی گیت پر یا منظر پر خوش بھی ہو لیتے۔ سر بھی ہلا دیا۔ ساتھ ساتھ کلچر کی بحث بھی اٹھاتے رہے مگر پھر دس پندرہ منٹ کے بعد اکتا بھی گئے۔

"مولانا یہ تو بکواس ہے —— آئیے کہیں اور چلتے ہیں"

اس کے بعد کہیں اور —— اور جب تک شہر کا آخری اوپیرا بند نہ ہو جاتا۔ "دو کہیں اور" کا سلسلہ بند نہ ہوتا۔ ریستورانوں میں بیٹھنے کا بھی یہی ہنجار تھا۔ ایک سے دوسرے میں دوسرے سے تیسرے میں۔ کہیں دو منٹ کو بیٹھ جاتے، کہیں لوگ بہت زیادہ ہوتے کہیں بہت کم ہوتے۔ ہر رات قریباً سارا شہر گھوم کر لوٹتے وہ تھوڑی سی مہلت میں بہت کچھ دیکھ لینا چاہتے تھے، کیسی بھی جگہ ہو، ایک مقام سے بہت جلد ان کی طبیعت بھر جاتی تھی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے بھی شاید اسی لیے وہ بہت جلد اکتا گئے۔

سیر و سفر میں کبھی کبھار وہ بے مقصد و بے اختیار ہو کر —— جیسے ندی میں کوئی سنگِ رواں آوارہ —— گھومنے کے بھی بڑے حامی و مبلغ تھے۔

"مولانا ان پٹی پٹی شاہراہوں میں دھرا ہی کیا ہے"

"مولانا زندگی بڑی بیکراں چیز ہے"

"مولانا زندگی کو آگے پیچھے شمال جنوب ہر طرف سے دیکھنا چاہیے"

"مولانا آئیے آج ہم اپنے آپ کو شہر پر چھوڑ دیں"

اور اپنے آپ کو شہر پر چھوڑنے کے معنی یہ ہوتے کہ وہ حسرت صاحب جو صبح کی سیر میں بھی

پیدل نہ چلتے تھے، گھنٹوں شہر کے دالان در دالان قسم کے عقبی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ایک مرتبہ اپنے آپ کو جزیرے پر چھوڑتے چھوڑتے" ہم ایک ایسے ساحلی کمپونگ یعنی گاؤں میں جا نکلے جہاں تک پہنچنے سے پہلے ایک وسیع و طویل دلدل کے اوپر تنگ تختوں کے ایک جھولتے لرزتے "پل صراط" پر سے گذرنا پڑتا تھا، جن لوگوں نے مرشد کو دیکھا ہے وہ ان کی مصیبت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مگر زندگی کو آگے پیچھے سے دیکھنے کے ولولے میں وہ اس "پل صراط" پر سے بھی گذر گئے!

یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ انہیں دنوں مرشد کے دوست مشہور ادیب پروفیسر احمد علی ہندوستان سے چین جا رہے تھے۔ ان کا جہاز شب کے چند گھنٹوں کے لیے سنگاپور میں رک رہا تھا، مرشد ایک مدت سے ان کی راہ تک رہے تھے۔ اور ان کے چند گھنٹوں کے قیام کو پُر لطف بنانے کے لیے کوئی پورے تین شب و روز کی مصروفیت طے کر چھوڑی تھی، لیکن اتفاق دیکھیے۔ کہ جس شام احمد علی وہاں پہنچے۔ مرشد کو سو کر جاگنے، جاگ کر اٹھنے، اٹھ کر تیار ہونے اور پھر دو تین ساغر برائے ملاقات میں اتنی دیر ہو گئی۔ کہ جب ہم لوگ جہاز پر پہنچے تو پروفیسر صاحب شہر کی گشت پر نکل چکے تھے۔ اب انہیں ڈھونڈنے کا مرحلہ شروع ہوا جاوید نے کہا کہ اتنے بڑے اجنبی، پُر اسرار شہر میں اندھا دُھند تلاش سے کون مل سکتا ہے۔ لیکن مُرشد بہت پُر اُمید تھے۔ فرمایا ـــــ کیوں نہیں ملے گا۔ مجھے معلوم ہے احمد علی کو کہاں ہونا چاہیے۔ میرے بھائی میں احمد علی کو جانتا ہوں" ـــــ تلاش شروع ہوئی تو احمد علی کو جہاں جہاں ہونا چاہیے تھا۔ ایک ایک مقام چھان مارا مگر وہ خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے تھے کوئی بارہ بجے کے قریب مرشد یہ کہہ کر کہ ذرا تازہ دم ہو کر ابھی پھر نکلتے ہیں۔ ایک چینی طرب خانے میں گھس گئے اور وہاں جام و مینا سے نہ معلوم کیا سرگوشیاں ہوئیں کہ خیالات کا دھارا احمد علی کو پا سکنے کی رجائیت کی طرف سے یکبارگی احمد علی کو نہ پا سکنے کی قنوطیت کی طرف مُڑ گیا۔ بولے:

"مولانا یہ احمد علی تو ملتا دکھائی نہیں دیتا۔"

"کیوں؟" —— ہم نے پوچھا۔

"مولانا چینیوں کے اس شہر میں احمد علی کا ملنا ناممکن ہے بات یہ ہے کہ سامنے کے رُخ احمد علی بھی ساٹھ فیصد چینی معلوم ہوتے ہیں اور چینیوں کے انبوہ میں کسی چینی سے آپ خط و کتابت تو کر سکتے ہیں اسے شناخت نہیں کر سکتے —— اب اس کو جہاز پر ہی پکڑ لیں گے پھر وہیں بیٹھے بیٹھے مرشد نے جو احمد علی کی باتیں شروع کی ہیں کہ وہ کتنا پیارا آدمی ہے۔ کتنا نڈر ادیب ہے، کتنا قیمتی دوست ہے تو درمیان میں ہماری وقفہ بہ وقفہ یاد دہانیوں کے بعد طرب خانے سے اُٹھ کر جب جہاز پر پہنچے تو جہاز ہانگ کانگ کو روانہ ہو چکا تھا۔ بعد میں خط و کتابت سے معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب نے بھی اس شب اپنے آپ کو سنگاپور پر چھوڑ رکھا تھا۔

مرشد کھانے سے زیادہ پینے کے قائل تھے، تاہم ادب کی طرح کھانے کا بھی بڑا ہی کلاسیکی ذوق رکھتے تھے۔ ذائقہ تو بعد کی بات تھی۔ کھانے کی صورت بُری ہوتی تو اس پر بھڑک اٹھتے طبیعت منغص ہو جاتی۔ اشتہا مر جاتی۔ کھانا کھانے کے بجائے کھانا نہ کھانے کے حق میں تقریر کرتے۔ نوابانِ اودھ، سلاطینِ کشمیر اور قطب شاہی علی قلی خانوں کے مطبخوں، دسترخوانوں کے متعلق وہ جو وسیع ذاتی معلومات رکھتے تھے۔ ان معلومات نے مرشد کو اس ضمن میں کچھ اور بھی مشکل پسند بنا دیا تھا۔ ذائقے اور تنوع کے لحاظ سے کشمیری کھانے کو کھانوں کا بادشاہ مانتے۔ شب دیگ، گوشتابہ، یخنی، آفتابہ وغیرہ کشمیری کھانوں کی ایک طویل فہرست تھی جو ہمیں ہر کھانے پر سننا پڑتی۔ بارہا مرشد نے شب دیگ خود اپنے ہاتھ سے دم کرنے کا پروگرام بنایا لیکن دیگ میسر آ سکی نہ شب ایک مرتبہ ایک چینی لکھ پتی کی دعوت پر جب کوئی پچاس کورس کے مینو سے سابقہ پڑا۔ جس میں چینی باورچیوں نے چڑیا کی ایک چونچ میں ترش، نمکین، شیریں پہیلی بنا کر سامنے رکھ دی تھی تو مرشد چینیوں کی عظمت کے بھی قائل ہو گئے تھے مگر قیادت

کا جھنڈا پھر بھی کشمیر ہی میں لہراتا رہا۔

دو سال کے بعد مرشد ۸ رفروری ۱۹۴۷، کو ہم سے رخصت ہوئے۔ احباب کا ایک ہجوم الوداع کہنے کو ساحل پر موجود تھا۔ جس میں فوجی افسر، سردار، سپاہی بھی شامل تھے۔ مقامی ملاقاتیوں کا بھی ایک جم غفیر پہنچا ہوا تھا۔ ملائی معززین، عرب سوداگر، چینی آرٹسٹ اور ہیپی ورلڈ اور گریٹ ورلڈ کے خدمت گار ایک اجنبی کو رخصت کر رہے تھے۔ ان میں بہت تھوڑے تھے جو ادیب چراغ حسن حسرت کی عظمت سے واقف تھے۔ ان لوگوں کو انسان چراغ حسن حسرت کی محبت جزیرے کے کونے کونے سے کھینچ لائی تھی۔ ہم سے ہمارا مرشد جدا ہو رہا تھا۔ سپاہی ایک ایسے افسر کو رخصت کر رہے تھے جو افسروں کی نوع ہی سے مختلف تھا۔ مقامی احباب اس شخص کو الوداع کر رہے تھے جس سے مل کر وہ ایشیا کے ایک عظیم ملک کی رُوح میں جھانک سکے تھے۔ ہیپی ورلڈ کے خدمت گار اس محسن سے محروم ہو رہے تھے جو چائے پیئے بغیر بھی بڑی باقاعدگی، بڑی فیاضی سے ان کو ٹپ دیتا تھا۔ اور جب عظیم "ڈیور شائر" لنگر اٹھا کر آبنائے ملاکا کے کھلے دہانے کی طرف رینگنے لگا، تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کے وہ دو سال ہماری پوری زندگی پر پھیل گئے ہوں۔ جذبات کے ایک مشترکہ جھٹکے سے ہر دل بوجھل، ہر آنکھ نمناک ہو گئی مگر جو شخص بچوں کی طرح بلبلا کر رو پڑا۔ وہ مرشد کا اردلی عنایت اللہ تھا۔ جو مرشد کو بچوں کی طرح پالتا رہا تھا۔

وُہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

لاہور کا قطبُ

مولانا صلاح الدین مرحوم اس دور کی ادبی شخصیتوں میں ایک الگ روش رکھتے تھے وہ ایک مینار نور تھے۔ مسافتیں جس کے حوالے سے ناپی جاتی ہیں، اور تہذیب جس کی روشنی میں راستہ ڈھونڈتی ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ، اپنے اس محسن اور صاحبِ طرز ادیب کو ہمیشہ یاد رکھے گی اور مجھے یقین ہے کہ

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت

مولانا کی ذات میں محبوبیت و دل نوازی کے بہت سے اوصاف جمع ہو گئے تھے۔ ایک خوبی ان کی وسیع انسانی ہمدردی تھی۔ شہد سے زیادہ میٹھے، پھول سے زیادہ نرم ہمہ شائستگی یکسر خُلق۔ آدمی ان کے سامنے بیٹھ کر اپنے آپ کو انسانی عظمت کے حضور بیٹھا ہوا محسوس کرتا۔ وہ جتنے بڑے ادیب تھے، اس سے زیادہ بڑے انسان تھے۔ مسرتوں کا سرچشمہ محبتوں کا لنگر۔ مولانا کی موت کا زخم ابھی بہت تازہ ہے۔ ان کے لاتعداد "مریدوں" کی طرح، اس صدمے کی براہِ راست ضرب میرے دل پر بھی پڑی ہے ابھی اس رُوداد کو میرے آنسو بھی بیان نہیں کر سکتے، میرے الفاظ کیا بیان کریں گے ــــــ! ستاروں کا میلہ میرے سامنے سجا ہوا ہے، حیران ہوں، کس ستارے کو سرِعنوان بناؤں؟

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

دوسری جنگِ عظیم، اتحادیوں کے حق میں، لڑائی کا پانسا "العالمین" کی لڑائی سے پلٹا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد کا "ادبی دنیا" میری ادبی زندگی کا "العالمین" تھا۔ واضح شعور کے ساتھ میری شاعری کی عمر چار، پانچ برس ہو چکی تھی۔ میری نظمیں اِدھر اُدھر چھپ بھی

رہی تھیں مگر سب سے زیادہ خوشی مجھے اُس دن ہوئی، جب میں نے اپنی پہلی نظم "ادبی دنیا" میں دیکھی۔
اس دن کو، میں اپنے تابدار ترین دنوں میں سمجھتا ہوں۔ جیسے چوتھی جماعت میں وظیفے کا
امتحان دینا...... میٹرک کے امتحان میں دوسری کوشش میں کامیاب ہونا...... "ادبی دنیا"
—— پوری ادبی دنیا کا جگمگاتا ہوا سورج تھا۔ اس میں جگہ پانا، ادبی دنیا میں جگہ پانا تھا، جو
شاعر "ادبی دنیا" میں چھپتے وہ مجھے کسی اجنبی آسمان کے ستارے معلوم ہوتے۔ میں اسلامیہ
کالج لاہور میں پڑھتا تھا۔ "ریواز ہوسٹل" کی چار دیواری میں میری شاعری کا خاصہ چرچا تھا
ایک روز ہمت کر کے اپنی ایک نظم لکھ کر مولانا کے نام ڈاک میں ڈال دی۔ دل میں ڈر رہا
تھا کہ ہمارا "نامہ بر" یقیناً مارا جائے گا۔ اگر جواب آیا تو عبدالکریم کے جوتوں کی طرح نظم
ہی واپس آئے گی۔ چند روز بعد، جب مولانا کا مکتوب ملا تو یقین نہ آتا تھا کہ واقعی انہیں
کا خط ہوگا اس میں تو بڑے ہی کھلے دل سے، موتیوں کے سے لفظوں میں مجھے شاباش دی
تھی۔ اور محنت کی ہدایت فرمائی تھی۔ پھر اگلے مہینے جب "ادبی دنیا" میں نظم چھپ گئی تو مجھے
ایسا لگا کہ جیسے ؎

دونوں جہاں ہوں آج مرے اختیار میں

مولانا کے اس خط کو میں اپنی ادبی زندگی کی بنیاد سمجھتا ہوں۔ ادب و شعر کے لیے امنگ
و اعتماد کی پہلی قندیل، میری ذات میں، اسی خط سے روشن ہوئی۔ اس لمحے کی بے پایاں مسرت
کا احساس آج بھی ایک سنہری لکیر کی مانند، میرے محسوسات میں محفوظ ہے۔ میں آج جو کچھ بھی
ہوں، مولانا کا وہ خط ہوں —— میں تو کاروانِ شعر و ادب کی گرد میں چلنے والوں میں
سے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو ادب کی ایک پوری پود تھی جس میں موجودہ دور کے کتنے
ہی کجکلاہ شامل ہیں، کسی نہ کسی طرح اسی سرچشمۂ فیض سے رنگ رس حاصل کیا ہے۔ مولانا
صلاح الدین احمد اُردو ادب کے بادشاہ بھی تھے اور بادشاہ گر بھی۔

آتش آنست کہ در خرمن پروانہ زدند

مجھے مولانا کے قریب رہنے کا موقع نہیں ملا۔ ہاں وقفہ بہ وقفہ ملاقاتوں کی سعادت حاصل رہی۔ جب کبھی لاہور جانے کا اتفاق ہوا، حتی الوسع ان کی خدمت میں حاضری کا ناغہ نہ ہونے دیا۔ ہم نیازمندوں کے لیے شہر لاہور ان کی وجہ سے، مال روڈ، انارکلی وغیرہ سے ماورا، ایک جداگانہ معنویت رکھتا تھا ــــ بالخصوص مولانا چراغ حسن حسرت کے انتقال کے بعد مولانا صلاح الدین احمد کے لیے دوہرا پیار پیدا ہو گیا کہ یہ دونوں بزرگ آپس میں شباہت کی مشابہت رکھتے تھے۔ مولانا حسرت کے شاگرد میرے عزیز دوست کرنل مسعود احمد کے بقول مولانا صلاح الدین احمد سے مل کر ہمیں ایک "ٹکٹ میں دو مزے مل جاتے ہیں"۔ وہی متبسم چہرہ، بھاری بھاری مونچھیں، قد کاٹھ۔ نرم و شیریں، سُلجھی سُلجھی گفتگو۔

مولانا سے ملاقات "ادبی دنیا" کے دفتر میں ہوتی۔ لاہور میں کوئی دوسرا اپنے ٹھکانے پر ملے یا نہ ملے مولانا ضرور مل جاتے۔ وہ ان معنوں میں لاہور کے قطب تھے۔ میں جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کوئی نہ کوئی دوست (عموماً محبی مسعود احمد یا کیپٹن انعام قاضی) ضرور ساتھ ہوتے۔ آپ ہمیشہ کشادہ خاطری سے ملتے، حالانکہ ہم اطلاع کے بغیر جا دھمکتے۔ کام کاج چھوڑ کر ہمہ تن توجہ و شفقت بن جاتے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ مولانا کرسی پر بیٹھے ہیں سامنے لمبا چوڑا میز جس پر کاغذ ہی کاغذ۔ کتابیں ہی کتابیں۔ انبار اور مینار، جن کی اوٹ میں دفتر کا عملہ، منشی متصدی چھپ جاتے ایک کونے میں ان کی چھڑی کھڑی ہوتی، پاس ہی کہیں ان کا مشہور و معروف "سولہ ہیٹ" جس سے الگ کر کے مولانا کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کا ٹیلیفون عملاً دوسروں کی سہولت کے لیے وقف دیکھا۔ اہل علم و اہلِ قلم کا مرجع تو وہ تھے ہی، ہم نے ایک مرتبہ وہاں منٹگمری کا ایک اسکاؤٹ دستہ بھی دیکھا جس کے بیچ میں آپ

نشستہ ام کہ نسیمے کند شکار مرا

کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہتی۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ مصروفیت کے اس محاصرے میں نجانے اپنے نجی کاموں کے لیے کوئی ساعت کس وقت ملتی تھی؟

آخر آخر میں، اس مصروفیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر، احباب کے خطوط کے جواب تار سے دیتے۔ جو خرچ میں اضافے کی ایک نئی صورت تھی۔ مولانا کی زندگی میں نظم و ضبط کا تسلسل ہمیشہ موجود رہا۔ عادات مقرر، معمولات کے پابند۔ گھنٹوں بے تکان کام کرتے۔ قلم پر ایسی حاکمانہ قدرت کہ فرصت کے ذرا ذرا سے شگافوں میں بہت کچھ لکھ لیتے اور جو کچھ لکھتے گویا موتی پروتے چلے جاتے۔ دید و دانش کے موتی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مصروفیت کے اس سیلِ رواں میں ان کی کشادہ و بامروّت پیشانی پہ ناگواری کا کوئی ہلکا سا تاگا بھی دکھائی نہ دیتا۔ ان کے پاس بیٹھنے والا کچھ لے کر ہی اٹھتا۔

میں نے انہیں کسی کی برائی کرتے کبھی نہ سُنا۔ وہ اپنی جگہ چٹان ضرور تھے۔ مگر کسی کو فروتر نہ سمجھتے۔ ان کا کوئی حلقہ نہ تھا۔ وہ سب کے تھے۔ اپنے ادبی نظریات کے بارے میں ان کے ذہن میں کوئی دھند نہ تھی۔ مگر اپنے ادبی عقائد کو وہ سماجی تعلقات پر قطعاً اثر انداز نہ ہونے دیتے۔ وہ کسی سمن زار ماوراء النہر کے باسی نہ تھے۔ زندگی کی کش مکش سے کترا کر گزرنا بھی ان کا شیوہ نہ رہا۔ ہاں ان کی نگاہ ہمیشہ روشنی کی جویا رہتی۔ جس کا تذکرہ آ گیا اس کی خوبیوں کا ذکر کیا۔ حتیٰ کہ ادبی و فکری مباحث میں، اختلاف رائے کے باعث، جن لوگوں نے ان کی ذات پر ناروا حملے کئے، ان کی طرف سے بھی مولانا کے دل میں کدورت کا سایہ رہنے نہ پایا۔ نظیری نے ایسے انسانوں کے بارے میں کہا ہے

دوستاں از بدگمانی، وحشت از من می کنند
ورنہ من بر دشمن خود مہرباں گردیدہ ام

میرے دوست کرنل مسعود احمد، پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۴۸ء میں میرے ساتھ، مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں کرنل مسعود کو تقریباً گھسیٹ کر ہی لے گیا تھا کیونکہ ان کی رائے میں عظیم فنکاروں کو، ان کے آرٹ ہی میں ملنا موزوں و مامون ہوتا ہے۔ مگر مولانا سے مل کر وُہ بے حد محظوظ ہوئے کہ وُہ زندگی آموز ہی نہ تھے، زندگی آمیز بھی تھے۔ مولانا

تب سے مسعود کو "ادبی دنیا" کا اعزازی پرچہ برابر بھیج رہے تھے۔ مسعود اکثر کہا کرتے، وی پی تو مولانا بھیجتے نہیں کہ چھڑا لوں۔ سوچتا ہوں خود ہی کچھ رقم بھیج دوں۔ مگر میں جانتا تھا کہ مسعود یہ نہ کر سکیں گے کہ جب ان کے پاس وقت ہوتا ہے تو کام یاد نہیں رہتا اور جب کام یاد ہوتا ہے تو وقت نہیں ہوتا۔ لیکن ایک مرتبہ جب ہم دونوں لاہور گئے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مسعود کو یہ بات یاد آگئی۔ اتفاق سے مولانا اس وقت تنہا بھی تھے۔ مسعود نے بہت جھجکتے جھجکتے کہا۔

"مولانا دیکھئے نا میں کتنی مدت سے ادبی دنیا مفت ڈکار رہا ہوں۔ مولانا حد یہ ہے کہ رجسٹری کے پیسے بھی آپ اپنی گرہ سے بھر رہے ہیں —— مولانا میں اپنی کاہلی پر سخت نادم ہوں" —— اور اتنا کہہ کر، مسعود نے پانچسو روپے کا چیک، چپکے سے کھسکا کر جیسے رشوت دی جاتی ہے، مولانا کے سامنے رکھی ہوئی کتاب کے نیچے رکھ دیا۔ مگر مولانا چیک مسعود کو لوٹاتے ہوئے بولے۔

"مسعود صاحب! بعض اصحاب کو میں "ادبی دنیا" خود بھیجنا چاہتا ہوں —— اپنی خوشی کے لیے —— پھر قیمت کیسی؟"

مسعود نے کچھ اور اصرار کیا تو مولانا نے پوچھا!

"حال میں آپ کو کون سا شمارہ ملا تھا!"

"جولائی کا"

اس پر مولانا نے رسالے کے ایک انبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا —— "مسعود صاحب، جولائی کے شمارے کے چندے والے پرچے ابھی تک وہ رکھے پڑے ہے۔"

مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں مولانا چراغ حسن حسرت کی برسی پر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا مولانا کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ مولانا کا لاہور سے نکلنا سخت دشوار تھا۔ مگر بکمال مہربانی ہماری دعوت قبول کر لی۔ راولپنڈی تک ہوائی جہاز سے آئے لیکن آگے موٹر پر پہاڑی سفر میں

طبیعت خراب ہو گئی۔ مظفر آباد پہنچے تو اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں مشتاقانِ دید کا ہجوم ٹوٹ پڑا ہم ملاقاتیوں کو روکنا چاہتے تو مولانا الٹا ہمیں روک دیتے کہ صاحبو کیا کرتے ہو۔ میں تو خود سب سے ملنا چاہتا ہوں۔ پھر جلسے میں مقالہ پڑھا آخر تک بیٹھے رہے۔ مقالات سے ملا ہوا مشاعرہ بھی مقطعے تک سنا، حالانکہ طبیعت ناساز تھی۔ اور مشاعروں میں ان کے لیے بیٹھنا کچھ آسان نہ تھا۔

اگلے دن ہم نے انہیں راولپنڈی میں روکنا چاہا مگر نہ رُکے۔ دو چار گھنٹے آرام کر کے شام کے ہوائی جہاز سے لاہور روانہ ہو گئے۔ لاہور میں، جلد سے جلد واپس پہنچنے کی مجبوریاں کچھ اس نوعیت کی تھیں۔ "سرگودھا سے ڈاکٹر وزیر آغا آئے ہوں گے"

"ادبی دنیا" کی کاپیاں ...."

"کراچی سے اے ڈی اظہر، اُردو کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرنے آ رہے ہیں"

"رات کو منارڈ ہال میں انجمن ......"

ہم نے معذرت کی کہ مولانا اس سفر سے آپ کو بہت زحمت ہوئی۔ فرمایا ـــــ" میں تو بہت خوش ہوں کہ اس بہانے احباب سے ملاقات ہو گئی۔ ایک نیا علاقہ دیکھ لیا۔ کچھ تھوڑا سا قرض اپنے دوست مولانا حسرتؔ کا بھی چکا دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ سڑک کا سفر اور بالخصوص پہاڑی علاقے کا سفر ان پر ہمیشہ گراں گزرتا ہے۔ پھر وہ لاہور سے چلے بھی علیل سے تھے۔ لیکن ہم سے انہوں نے اشارۃً بھی تو اس کا ذکر کرنا پسند نہ کیا ـــــ اسی مروت و دلنوازی کا دوسرا نام صلاح الدین احمد تھا۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا۔ کہ دفتر میں میرے نوجوان رفیقِ کار مسٹر بشیر تبسم ملنے آ گئے۔ وہ اُردو کے ایم اے ہیں۔ اور اپنی اُردو دوستی کی لگن میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ مجھے کچھ لکھتے دیکھ کر پوچھا۔ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا۔ مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کی صحبت میں گزری ہوئی کچھ یادوں کو واپس بلا رہا ہوں۔ اس پر

تبسم نے اپنا ایک واقعہ سنایا :-

"میں ایم اے اُردو سال اوّل میں پڑھتا تھا۔ اور اُردو کے ہر طالب علم کی طرح مولانا سے ملنے کا انتہائی متمنی تھا۔ منٹگمری کالج سے میرے اُردو کے استاد ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم جب کبھی لاہور آتے تو مولانا کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے۔ ایک مرتبہ وہ مجھے بھی اپنے ہمراہ مولانا کی خدمت میں لے گئے۔ اور میرا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ میرے شاگرد تھے۔ اب ڈاکٹر سید عبداللہ کے شاگرد ہیں۔ یہ سن کر مولانا نے فرمایا۔ —— پھر تو یہ میرے بھی عزیز ترین ہوئے —— میں نے عرض کیا —— مولانا میں "ادبی دنیا" بڑے شوق سے پڑھتا ہوں —— یہ سن کر مولانا خوش ہوئے —— بولے —— اچھا! مگر صاحبزادے طالب علمی کے زمانے میں بعض وقت آدمی اپنے شوق کی تمام کتابیں خرید نہیں سکتا "ادبی دنیا" آپ یہاں سے لے جایا کریں"۔

آخری دفعہ کی ملاقات میں بھی مسعود یا شاید (اردو کے منفرد مزاح گو شاعر) نذیر احمد شیخ (مرحوم) میرے ساتھ تھے۔ مولانا حسبِ معمول کچھ لکھ رہے تھے۔ شاید ریڈیو کے لیے کوئی تقریر زیرِ قلم تھی۔ حسبِ معمول، دیکھتے ہی قلم رکھ دیا۔ تپاک سے ملے۔ ہم نے کام میں مخل ہونے پر معذرت چاہی تو ہنس کر بولے —— بہت اچھا ہوا کہ آپ آگئے ورنہ میرے دل پر بوجھ سا رہتا"۔

"بوجھ کیسا؟" ہم نے پوچھا

"بات یہ ہے" مولانا بولے "میں ہر روز بس اتنا کام ہی کرتا ہوں، جتنا کہ میرے نان و نفقہ کے لیے ازبس ضروری ہو۔ آج دن بھر کی مزدوری ہو چکی تھی یہ مضمون لالچ کے کھاتے میں جا رہا تھا" —— پھر دیر تک اسی ہمدردی و شگفتگی کے ساتھ جو ان کی سرشت کا خاصا تھی، باتیں کرتے رہے۔ ان کی صحت بظاہر خاصی تھی۔ البتہ بیگم کے انتقال سے چہرے پر اضمحلال و آزردگی کے آثار پیدا تھے۔ باتوں باتوں میں دوپہر کے کھانے کا

وقت آگیا تو اصرار کر کے ہمیں، قریب ہی لاہور کے ایک اعلیٰ ریستوران میں لے گئے ڈاکٹر وزیر آغا کو بھی فون کر کے بلا لیا۔ کہنے لگے میں دوپہر کا کھانا دفتر کے آس پاس کسی ہوٹل ہی میں کھا لیتا ہوں۔ گھر کون جائے؟ اور اب تو گھر میں بیوی بھی نہیں ہیں بچیوں کو کیا زحمت دوں۔ یہ صرف بچیوں ہی کی بات نہ تھی۔ یہ مولانا کی سیرت و اصول کی بات تھی۔ وہ بڑے سے بڑے دکھ کو اندر ہی اندر پی جاتے۔ مگر دوسروں کو آزردہ کرنا یا کسی کو خفیف سے خفیف زحمت دینا ہرگز پسند نہ کرتے۔

ریستوران سے اُٹھ کر مولانا ——"ایوان ادبی دنیا" کے زینوں سے اُوپر چڑھ گئے۔ جہاں سے پھر اُترتے ہوئے میں نے ان کو کبھی نہ دیکھا۔ اور میری ارادت سے پوچھیے تو مولانا اب بھی وہیں اپنی کرسی پر بیٹھے ہیں ...... وہی میز، وہی کتابوں کے ڈھیر، وہی مسکراتا ہوا چہرہ ...... کونے میں چھڑی ...... اور کتابوں کے مینار پر مولانا کا سولہ ہیٹ۔

گرامی از درِ پیرِ مغاں سر برنمی گیرد
دل اینجا، دلبر اینجا، مدعا اینجا، اُمید اینجا

(مولانا کے انتقال پر لکھا گیا)

چیونٹی اور پہاڑ

ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری کے چوتھے مجموعہ کلام "چراغِ سحر" کی اشاعت، تاریخ ادب کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اول تو اس لیے بھی کہ اب ان کے کسی نئے مجموعے کی توقع کچھ اٹھتی جارہی تھی توقع اس لیے نہیں اُٹھ رہی تھی۔ کہ خدانخواستہ حفیظؔ صاحب بیٹھ گئے تھے وہ تو اس وقت پچھتر برس کی عمر میں بھی ماشاء اللہ جوانوں والا "تہیہ طوفان" رکھتے ہیں۔ ان کا قلم جولانی سے چل رہا ہے نظم میں بھی اور نثر میں بھی۔ چنانچہ "چراغِ سحر" کے ساتھ ساتھ چیونٹیوں کی زندگی کے بارے میں نثر کی ایک کتاب بھی حال ہی میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ نام ہے "شاہنامہ" کے اسلوب پر "چیونٹی نامہ" لوگوں کو "چیونٹی نامے" پر حیرت ہوئی ہے۔ مجھے "چراغِ سحر" کی اشاعت پر حیرت ہوئی ہے کہ ایک مدت سے حفیظ صاحب کی طبیعت جتنی شعر کہنے کی طرف راغب ہوئی ہے۔ اتنی شعر کی اشاعت پر آمادہ نہیں ہوتی۔ چیونٹی نامے پر حیرت اس لیے نہ ہوئی کہ اس کا مسودہ اتنی مدت سے پڑا تھا کہ اگر اب چھاپے خانے میں نہ جاتا، تو اس کو خود چیونٹیاں کھا جاتیں۔ مجھے حفیظؔ صاحب کی خدمت میں ۱۹۳۹ء سے نیاز حاصل ہے، کئی برس ایک محکمے میں ان کے نیچے کام کرنے اور ایک ہی مکان میں ان کے اوپر قیام کرنے کا اتفاق ہوا ہے میں یہاں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ان کی صحبت سے بہت کچھ سیکھا ہے اور ان کی شفقت میری متاعِ فخر ہے۔ اس طویل مدت میں ہم نے یہ بھی دیکھا کہ حفیظؔ صاحب کے جتنے گہرے مراسم چیونٹیوں سے ہیں اتنے انسانوں سے بھی نہ ہوں گے۔ وجہ یہ کہ چیونٹی ان کے بقول، انسانوں سے کہیں زیادہ محنتی، مخلص اور منظم و منتظم مخلوق ہے۔ شاعر حفیظؔ پبلک "پراپرٹی" ہے۔ میں ایک عرصے سے روز مرہ کے

حفیظ کے بارے میں کچھ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں ۔ مگر وجہ انہوں نے کہا ہے کہ ؎

ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے

سو میں بھی ارادے باندھتا اور توڑتا ہی رہ گیا اور حفیظ صاحب اتنے میں شخص سے شخصیت بن گئے ۔ یہیے ان کا ایک اور شعر یاد آ گیا۔

حفیظؔ اپنی ترقی شعر میں یہ ہے کہ اس فن کو
بہت آساں سمجھتے تھے بڑا مشکل سمجھتے ہیں

یہ شعر شاعری کے علاوہ ان کی شخصیت پر بھی حاوی ہے۔ چنانچہ سوائے شاعری کے ان کی کوئی چیز آسان نہیں رہ گئی ۔ بازار میں آپ کبھی ان کے ہمراہ سودا سلف خرید کر دیکھئے ایک روپے کی چیز پر پانچ روپے کی فاعلاتن فاعلات کرتے ہیں۔ سبزی والے کے کھارے سے ٹماٹر اس طرح چھانٹتے ہیں، جیسے انتخاب کلام داغ کر رہے ہوں۔ گوشت کی عمدگی و تازگی کے مسئلے پر قصابوں سے اس شد و مد کی بحث کرتے ہیں کہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ آپ اب تک کسی قصاب کے ہاتھوں قتل نہیں ہو چکے۔ گوشت ترکاری سے یاد آیا، شاعری کے علاوہ پیدل چلنا اور ہانڈی ریندھنا، ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ نہ وہ دوسروں (بالخصوص دوستوں) کا شعر آسانی سے پسند کرتے ہیں، نہ دوسروں کی ہانڈی کو گھر میں اپنا کمرہ اور اپنی ہانڈی الگ رکھتے ہیں۔ ان کا کمرہ دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ ؎

آگ ہے، ہانڈی ہے چولھا ہے دھواں ہے زندگی

صوفے کرسیاں، میز ملاقاتیوں کے لیے رکھے ہیں۔ ملاقاتی نہ ہوں، تو ان پر کتابیں بھی رہتی ہیں۔ خود فرش پر نشست رکھتے ہیں۔ سونا بھی فرش پر پسند کرتے ہیں تین طرف کتابیں، بیاضیں، خطوط، کاغذات، چوتھی طرف چولہا، کھانے پینے کے برتن، چلغی، اچار، چورن، معجون امرت وغیرہ! ایک طرف ذہن کی ورکشاپ پر غزل ابل رہی ہے۔ دوسری طرف چولہے پر قیمہ۔ اد

مصرعۂ تر ادھر لقمہ تر۔ ساتھ ساتھ دوستوں سے گپ شپ۔

حفیظ صاحب، ابوالاثر اپنے "پتھر اور دھات" ہی کے زمانے میں بن گئے تھے۔ بعد میں "خان بہادر"، حسان الملک بہادر" ہوئے۔ پھر انگریزی میں ترجمہ ہو کر ڈائریکٹر جنرل تک پہنچے۔ مگر طبعاً وہ ہاتھی، گھوڑے کے آدمی کبھی نہیں رہے، ہمیشہ چیونٹی کے آدمی رہے۔ پیدل آدمی۔

ان کا پکایا ہوا سالن ضرور کھانا چاہیے، مگر ان کے ساتھ پیدل گشت کی سفارش میں نہیں کر سکتا۔ ناپ تول کے اعشاری نظام کے مطابق راولپنڈی میں ان کی روزانہ پیدل گشت کو سیدھا کر کے ناپا جائے۔ تو شام کے وقت انہیں گوجر خان میں ہونا چاہیے۔ جو دوست ان کے ساتھ جتنا پیدل چل سکے، اتنا ہی ان کے دل کے قریب۔ جس طرح ان کا خانساماں ہانڈی کے سوا باقی سب کام کرتا ہے اسی طرح ان کا ڈرائیور کبھی کبھار موٹر چلاتا ہے۔ کوئی دوست موجود نہ ہو تو حفیظ صاحب ڈرائیور کو لے کر پیدل گشت پر نکل جاتے ہیں۔ وہ بیک وقت دو حیثیتوں سے چلتے ہیں۔ ایک وہ جیسے کوئی تھانیدار اپنے حلقے کا دورہ کر رہا ہو کہ معاشرے میں کوئی بدنظمی تو سر نہیں اٹھا رہی۔ اور دوسری حیثیت وہ جیسے کوئی شاعر، کوئی فن کار، علم و ادب کی پیاس بجھانے کے لیے زندگی کے مظاہر کے سامنے جھولی پھیلائے گھوم رہا ہو۔ چلتے ہیں وہ مسافت کم زندگی زیادہ طے کرتے ہیں۔ کوئی منظر ایسا نہیں جس میں ان کے لیے کوئی سبق، لطیفہ، تماشہ وغیرہ موجود نہ ہو۔ وہ تنہا بھی چلیں، تو زندگی کا جلوس ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ راہ چلتے ہوئے کسی دوکان پر کوئی سائن بورڈ لکھا نظر پڑ جائے، تو اس کو پڑھے، بلکہ گائے بغیر قدم نہیں اٹھاتے۔ سائن بورڈوں کی انگریزی عبارت ان کے مشہور و مقبول ترنم میں سُننے کے لائق ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک ہر عبارت ہیں آہنگ مضمر ہوتا ہے۔ بعض سائن بورڈوں کی عبارت کی تنہائی دور کرنے کی خاطر دوسرا مصرعہ یا ٹکڑا بھی وہیں فی البدیہہ گنگنا دیتے ہیں۔ مثلاً:۔

پیدل چلتے ہوئے ان کی سب سے زیادہ توجہ چیونٹیوں کی طرف رہتی ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں ان کی کوٹھی کے بیرونی باغ میں چیونٹیوں نے اپنا بہت وسیع ہیڈ کوارٹر قائم کر رکھا ہے آپ صبح وشام دو وقت اس پڑاؤ کو دیکھنے جاتے ہیں۔ کہ ان کے ٹریفک کے نظام میں کوئی خلل تو نہیں آگیا؟ چیونٹیوں کے بارے میں معلومات کا دانہ جہاں مل جاتا ہے، اسے اٹھا کر اپنے کاغذات میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے اسی طرح چیونٹی چیونٹی کر کے جمع کی ہے میرا خیال ہے ابھی اتنی بڑی ایک اور کتاب کی چیونٹیاں ان کے پاس فالتو پڑی ہیں۔ راہ چلتے ہوئے چیونٹیوں کا کوئی جلوس آتا جاتا ملے تو ٹھٹھک کر ماجرے کی تہہ تک پہنچ کر رہیں گے کہ کیڑیوں کا جنازہ جارہا ہے، برات ہے یا فرقہ وارانہ فساد؟ ویسے ان کے اندازِ معاشرت اور اسلوبِ خانہ داری میں حفیظ صاحب کے درک کا یہ عالم ہے کہ کیڑیوں کی قطار دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ آیا یہ راشن کی قطار ہے یا ملکہ کی سواری ——— کسی موٹے تازے "پھٹے ہوئے" مکوڑے کو غضب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے ارشاد فرمائیں گے۔ "اس حرام خور کو دیکھتے ہو؟ یہ سود خور مہاجن ہے، غنڈوں کا سرغنہ، غریب چیونٹیوں کا استحصال کر رہا ہے۔" اور غریب چیونٹیوں کو حفیظ صاحب مہر و شفقت سے چھلکتی ہوئی۔ کچھ ایسی احسان مند نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ ایسی نگاہوں کے لیے ان کے دوست ترستے ہیں۔ "چیونٹی نامہ" کو نثر میں لکھا دیکھ کر ایک گونہ اطمینان ہوا۔ ورنہ مجھے تو ڈر تھا کہ وہ چیونٹیوں سے اپنے گہرے لگاؤ، ان کے عادات وخصائل کے بارے میں وسیع معلومات اور سب سے زیادہ اپنی قادر الکلامی کے بہاؤ میں چیونٹیوں کو بھی منظوم کر دیں گے جو ان کے لیے نسبتاً آسان بھی ہوتا۔ مگر انہوں نے یہ کتاب نثر میں لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ نثر کے میدان میں بھی اپنا جھنڈا اگاڑ دیا ہے یہ کتاب لکھ کر حفیظ صاحب نے زبان اور انسان، دونوں کی خدمت کی ہے۔ چیونٹیوں کے معاشرے کی تصویر، ایسے دلکش اور مؤثر انداز میں کھینچی ہے کہ اس میں انسانوں کے لیے ایسی بہت سی عبرتیں

سمٹ آئی ہیں۔ کہ بے اختیار چیونٹی کے نقشِ قدم پر چلنے کو جی چاہتا ہے۔

"چراغِ سحر" کی اشاعت پر میں اپنے جذبۂ حیرت کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بے حد خوشگوار حیرت ہے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد ایک عرصے تک ہمیں قیام و خرام کا ایسا موقع حاصل رہا ہے کہ ان کے شعر کی "پہلی اذان" ہمارے ہی کانوں میں پڑتی تھی گزشتہ ربع صدی میں ہم نے تو حفیظ صاحب کو اپنے کسی شعر پر پورے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے نہیں دیکھا؛ حالانکہ شعر وہ اس ریاضت و جانکاہی سے کہتے ہیں کہ شاعر اور شعر دونوں پر ترس آتا ہے۔ شعر ان پر موسلا دھار نہیں برستا، بوند بوند ٹپکتا ہے پہلے تو وہ خیال اور مضمون ہی کو اپنے ذہن کی "چاٹی" میں رکھ کر مدتوں اسے دودھ کی طرح بلوتے رہتے ہیں۔ ایک شعر کہنے کی خاطر بیک وقت درجنوں نظائر کو زیرِ تفتیش رکھتے ہیں۔ اپنے مفہوم تک کئی رستوں سے ہو کر پہنچتے ہیں۔ اُن کی رائے میں ہر خیال اپنے اظہار کے لیے الفاظ بھی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ مگر شاعر کو یہ الفاظ ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ جو ایک کٹھن اور طویل تعاقب کا عمل ہے۔ یہ تلاش کم و بیش ویسا ہی عمل ہے جس طرح کوئی شکاری جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تیتر کو تلاش کرتا ہے۔ اس تلاش کے دوران بعض شکاریوں کی طرح بعض شاعر بھی دلاتے میں تھک ہار کر تیتر کی بجائے فاختہ مار لاتے ہیں۔

جیسے جذبہ تو الفاظ میں ڈھل گیا، مگر اب حفیظ صاحب نے شعر کے پیکر کو خاتم کاری کے عمل کی خاطر "خراد" پر چڑھا دیا تاکہ اس کے پیرہن میں کوئی سلوٹ اور چہرے پر کوئی مساسہ باقی نہ رہے۔ شعر کے حسن و جمال کا کمال ان کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا زیور، شعر کے اندر رہے، باہر نہ ہو۔ الفاظ کی چھانٹی میں حفیظ صاحب اتنے سخت، بلکہ میں تو کہوں گا کہ سنگدل واقع ہوئے ہیں کہ الفاظ اگر ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے آ بھی جائیں، تو دفتر روزگار کے امیدواروں کی مانند سو میں سے نوّے لفظوں کو اُلٹے پاؤں واپس جانا پڑتا ہے وہ چٹانوں، پھول اور پھولوں کے قلعے بنانے کے قائل نہیں ایک رنگ کے مضمون کو صرف ایک ہی

رنگ میں باندھتے ہیں۔ سو رنگ میں نہیں باندھتے اور اس قدر رکم الفاظ میں باندھتے ہیں کہ بعض اوقات آدھا مضمون کھلا رہ جاتا ہے۔ ؎

سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

شعر کو بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب کہا جاتا ہے۔ حفیظ صاحب کے نزدیک الفاظ کی بہترین ترتیب کی پہچان یہ ہے کہ شعر کو تحت اللفظ میں بھی پڑھیں، تو وہ ٹھنک اٹھے۔ سو، اپنے لفظوں میں طاہرہ سید کے لہجے کی شیرینی بھرنے کے بعد جب حفیظ صاحب بالآخر (اور بادل ناخواستہ) اپنے شعر کو "خراد" سے اتارتے ہیں، تو وہ دراصل دس بارہ جڑواں شعروں کا عطر ہوتا ہے۔ آسان شعر کو جس مشکل سے حفیظ صاحب کہتے ہیں اس کی دوسری مثال اس خاکسار کے علم میں نہیں ہے ان کا شعر بظاہر نہایت سادہ وسلیس، بن بلایا ہوا سا شعر معلوم ہوتا ہے، مگر جتنا غور کرو اتنی ہی پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔

شعر، شاعر کی معنوی اولاد ہوتا ہے۔ حفیظ صاحب سچ مچ اسے کلیجے کا ٹکڑا سمجھتے ہیں وہ اس کی نوک پلک فی الواقعہ اسی لگن اور ممتا سے سنوارتے جس طرح کوئی سگھڑ ماں اپنے بچے کو بنا سنوار کر، منہ دھو دھلا کر، بودی چپڑ کر مدرسے بھیجتی ہے۔ آپ اس کا بستہ بھی خود باندھتے اور اس ہنرمندی سے باندھتے ہیں کہ نہ کوئی "الف" گرتا ہے نہ کوئی "ی" دبتی ہے۔ الفاظ کو وہ اس طرح ناپ ناپ کر اور گن گن کر رکھتے ہیں کہ پاؤ چھٹانک والے وزن میں بھی شاید ان کے مصرعے ہم وزن ہی نکلیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ان کے ہاں ہر لحظہ جاری رہتی ہے۔ وہ اپنے شعر کے کسی چوکھٹے کو قطعی نہیں سمجھتے۔ ہم نے انہیں ۱۹۷۳ء میں ۱۹۱۲ء کے اشعار سے دست و گریباں دیکھا ہے ان کی ہر پہلی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ان کی دوسری کتاب کا پہلا ایڈیشن معلوم ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کی طرح ان کے شعر کی برومندی بھی ان کی بے پایاں محنت کا ثمرہ ہے۔ قدرت نے ان کو شاعر ہی پیدا کیا تھا۔ لیکن اگر وہ فن پر اتنی عرق ریزی نہ کرتے تو پیدا ہو کر شاعری کا انگوٹھا ہی چوستے رہتے۔

حفیظ صاحب کی شاعری مشاہدات و محسوسات کا ایک وسیع اور رنگا رنگ نگار خانہ
ے رواں صدی کی دوسری دہائی کے آغاز میں اردو شاعری نے جس حفیظ کی ارادت
سندری اپنے کانوں میں ڈالی تھی، وہ مٹی کی خوشبوؤں، موسموں کے رنگ رس، جوانی کی
ڑکنوں، مکھڑوں کی چھپ منظروں کی سحر کاری اور گیتوں کے نغمہ زاروں کا شاعر تھا۔ ان
اچھوتی نظموں، بانکی غزلوں اور کنوارے گیتوں میں نغمگی کا جادو بھی تھا۔ اور زندگی کی دھوپ
ماؤں بھی۔ شکایات بندگانِ خدا بھی اور حکایتِ زُلف و رُخ بتاں بھی۔ پروفیسر احمد شاہ
س بخاری نے نغمہ زار کے دیباچے میں اسی شاعر کو "ساحر" کہا تھا۔ حفیظ کی ریاضتِ فن
ے نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں، اس طویل مدت میں ان کا فن مختلف
ں سے وقفِ تابانیٔ زمین و زماں رہا ہے مگر ان کے فکروفن کے بنیادی محور حفیظ کے
عشق ہیں۔ عشقِ رسولؐ، عشقِ دین اور عشقِ پاکستان۔ حفیظ صاحب اپنی نمایاں انفرادیت
ساتھ اکبر، حالی اور اقبال کی لڑی کے شاعر ہیں۔

شاعری تشبیہات اور استعارات کا کاروبار بھی ہے۔ حفیظ صاحب کے لیے میں نے
پہاڑ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میں نے ان کی شاعری کے بارے میں جب بھی سوچا ہے، کسی
یع سلسلہ کوہستان کا نقشہ ذہن میں کھلتا گیا ہے۔ جس میں وادیاں بھی ہیں، چوٹیاں بھی، اور
ائیاں بھی، پھول اور چشمے بھی اور ننگی چٹانیں بھی۔ ترائی کے علاقے میں جس کو نغمہ زار کہنا
ہیے، ستاروں اور بہاروں اور گل رخوں کے جھرمٹ ہیں، بے آب و گیاہ، پتھروں کے
لقوں کی صلابت و سنگینی جھلسا دینے والی ہے، لیکن کچھ عجیب بات ہے کہ ان سنگین
لقوں کی عظمت و جبروت کا بھی یہ عالم ہے کہ اگرچہ:

نہ اس میں گھاس اُگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

جغرافیہ کی رُو سے یہ پہاڑ کہیں بھی واقع ہو اس کی پگڈنڈیاں دوسری طرف جا کر کشمیر

میں اترتی ہیں اور اس کے بڑے بڑے درّوں کے رُخ ارضِ حجاز کی طرف کھلتے ہیں بعض چو
گلہ ہے گاہے آتشیں لاوا بھی اگلتی ہیں۔ مجموعی طور پر اس سلسلۂ کوہستان کو "کوہِ ہندو کُ
کہنا کچھ غلط نہ ہوگا۔

"چراغِ سحر" کی بیشتر نظمیں قیام پاکستان کے بعد کی تخلیقات ہیں اور کسی نہ کسی ملی د
یا سانحے کی آنچ سے تپ کر نکلی ہیں۔ یہ ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جس کے شعر کا مرنا جینا
سے وابستہ ہے۔

حفیظ صاحب نے بعض نظموں کے ساتھ کچھ وضاحتی اشارات بھی رقم فرمائے ہیں
یہ رَل میں رجز ملانے والی بات ہے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ان اشارات سے ا
سمت کے علاوہ ان کی زندگی کا ایک سوانحی خاکہ بھی خود بخود سامنے آتا چلا گیا ہے۔ ح
ہماری ان چند اہم شخصیتوں میں سے ہیں جو زندگی کے ایک پورے دور کی دھڑکن
علامت بن جاتی ہیں اور وقت کی لکھی ہوئی سُرخیوں میں ان کا خون بھی شامل ہوتا
ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حفیظ صاحب کا
شعر ہے ؎

اگر موج ہے بیچ دھارے چلا چل
وگرنہ کنارے کنارے چلا چل

وہ جس طرح ہاتھی گھوڑے کے آدمی نہیں رہے، اسی طرح کنارے کے آدمی
رہے وہ منجدھار کے آدمی ہیں ؎

لے چل ہاں منجدھار میں لے چل ساحل ساحل کیا چلنا
تُو مری اتنی فکر نہ کر میں خوگر ہوں طوفانوں کا

میں عرض کر چکا کہ اس مجموعے کی بیشتر منظومات کا پہلا لمس ہمارے حصے میں آتا
ان دنوں میں اور محبی کرنل مسعود احمد (جو آجکل روزنامہ مشرق میں احوالِ واقعی کے

بے حد شگفتہ کالم لکھتے ہیں) اور محبی عزیز ملک صاحب اور برادرم کپتان انعام الحق قاضی
ر روزنامہ بادِشمال راولپنڈی) حفیظؔ صاحب کی خدمت میں تقریباً روزانہ حاضر ہوا کرتے
اور ان کی ہر تازہ نظم سن کر ہاتھ جوڑ کر عرض کرتے، "حفیظ صاحب قبلہ، آپ تو میٹھاس
رس کے شاعر تھے آپ کے لہجے میں تلخی۔ جھنجھلاہٹ اور قنوطیت کے سائے گھرے ہوتے
ہے ہیں۔ کرنل مسعود اپنی فوجی لغت میں کہا کرتے:" جناب ابوالاثر شعر تو دور مار
(LONG RANGE) توپ ہونا چاہیے یا پھر" پیراشوٹ" کی طرح چپکے چپکے قاری کے شعور میں اترنا
ہیے، مگر حضور کا شعر تو سنگین تان کر دست بدست لڑائی کرتا ہے"۔
مجھے تو حفیظؔ صاحب، شعر و ادب کا نکھٹو مکوڑا سمجھتے ہوئے چنداں لائق خطاب نہ
یتے۔ ہاں، مسعود کو ہنس کر جواب دیتے: "جانِ من! کرنیل جی! جرنیل جی! بعض مرحلوں میں
لے مورچوں میں دست بدست لڑائی بھی تو ناگزیر ہو جاتی ہے"۔ کبھی کبھی ان موقعوں پر اپنا یہ شعر
ں سنا دیا کرتے ؎

اس نئے دن کو ہوں میں رات سمجھنے والا
ہے کوئی آج مری بات سمجھنے والا

یہ آج سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔ اس اثنا میں حفیظ صاحب کی بہت سی باتیں
ماری سمجھ میں آ گئی ہیں، مگر نہ جانے کیوں ان کا یہ شعر بھی بار بار ذہن میں سرسرانے لگتا ہے۔

حفیظؔ اک طنز گفتار و شگفتہ کار شاعر تھا
نہ جانے میں کہاں اس ہمنوا کو چھوڑ آیا ہوں

مگر مجھے معلوم ہے کہ میں ساحل سے منجدھار کے آدمی کو آواز دے رہا ہوں۔

پوٹھوار کا بابائے اُردو

میں جن دنوں ثانوی جماعتوں میں پڑھتا تھا۔ عبدالعزیز فطرتؔ شعر لکھتے تھے۔ ان کی تخلیقات بلند پایہ جرائد میں کثرت اور عزت سے شائع ہوتی تھیں۔ ان کا شمار ملک کے ممتاز شعرا میں ہوتا تھا۔ کوہستانِ جہلم کے الگ تھلگ ماحول میں رہتے ہوئے، اس وقت تک میں یہی سمجھتا تھا۔ کہ بڑے بڑے شاعر —— لاہور، دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد وغیرہ میں پیدا ہوتے ہیں فطرتؔ صاحب کو میں کم از کم لاہور کا شاعر سمجھتا تھا لیکن کچھ مدت بعد، جب راولپنڈی تک میری آمد و رفت کی صورتیں پیدا ہونے لگیں تو اپنے دوست جناب عزیز ملک سے، جو ان دنوں گارڈن کالج کے طالب علم تھے اور آگے چل کر اردو کے منفرد انشا پرداز ہوئے، یہ معلوم ہوا کہ فطرتؔ راولپنڈی کے رہنے والے ہیں اور ڈاک کے محکمہ میں ملازم تھے۔

اب کچھ ٹھیک یاد نہیں۔ غالباً ۱۹۲۷ء کی بات ہے۔ میں راولپنڈی آیا تو شہر میں ایک مشاعرے کا آوازہ کان پڑا۔ میں شاعری کی الف، ب، ت کرنے لگ گیا تھا۔ اور راولپنڈی کے کسی برگزیدہ مشاعرے میں بار پانے کی دلی تمنا رکھتا تھا۔ عزیز ملک، میرے تعارفی و سفارشی بنکر مجھے مشاعرہ میں لے گئے جو گارڈن کالج کے ہال میں آراستہ تھا، آپ نے سٹیج پر جا کر مہتمم مشاعرہ کے کان میں کچھ پھونکا اور وہ دوسرے ہی لحہ میرے پاس تشریف لے آئے۔ گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ میری آمد پر کمال خوشنودی بلکہ اپنی خوش قسمتی کا اظہار فرمایا اور مجھے اپنے ساتھ اسٹیج پر لے گئے۔ یہ فطرتؔ تھے۔ اتفاق دیکھیے کہ ملک عبدالعزیز فطرتؔ سے میرا تعارف عبدالعزیز ملک کی وساطت سے ہوا۔

راولپنڈی میں اُردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں، فطرتؔ صاحب کی لگن اور سعی،

تذکرہ میں عزیز ملک کی زبانی سن چکا تھا۔ بعد میں یہ روداد خود میری اپنی آنکھوں کے سامنے سے گزرتی رہی واقعہ یہ ہے کہ مسلسل ایک ربع صدی تک راولپنڈی میں ادبی و تہذیبی سطح پر جو کچھ بھی ہوتا رہا، عبدالعزیز فطرتؔ ہی کی وجہ سے ہوا۔ پوٹھوار کی سرزمین اس وقت مذاقِ شعر و ادب کے لحاظ سے ایک سنگلاخ اور تاریک بیابان تھی۔ فطرتؔ پہلے لوگوں میں سے ہیں جو شعر و ادب کے چراغ کو ہتھیلی پہ رکھ کر نکلے اور اس لحاظ سے تنہا شخص ہیں جو کمال ثابت قدمی سے مسلسل پچیس تیس برس تک اس شمع کی لَو کو اپنے خونِ جگر سے تیز سے تیز تر کرتے چلے گئے۔ تا آنکہ ماحول میں چراغاں کا سماں پیدا ہو گیا۔ وہ تخلیقِ ادب کے علاوہ ترویجِ شعر و ادب کی بے پایاں لگن رکھتے تھے۔ خدمتِ فن کا یہ جذبہ ان کی زندگی کا مشن بھی تھا۔ اور ان کی روح کی آسودگی بھی۔ خطہ پوٹھوار کی ادبی تاریخ کا ایک پورا دَور عبدالعزیز فطرتؔ کے نام سے منسوب رہے گا۔ اور تاریخ ادب کا کوئی تذکرہ اُردو کے اس خاموش، مخلص، اور اَن تھک خدمت گار کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

فطرتؔ صاحب ایک مدت تک میرے لیے حضرت مولانا عبدالعزیز فطرتؔ رہے درمیان میں دوسری جنگِ عظیم کا ایک طویل وقفہ بھی حائل رہا۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد جب راولپنڈی میں یکجائی کی صورت پیدا ہوئی تو ہماری نیاز مندی ایک ہی جست میں دوستی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دوستوں کی ایک چوکڑی میں تبدیل ہو گئی۔ یہ چوکڑی فطرتؔ، ڈاکٹر گذدن، نذیر شیخ اور راقم الحروف پر مشتمل تھی۔ تیرہ چودہ برس یہ معمول رہا کہ نذیر شیخ شام سے ذرا پہلے اپنی موٹر پر میرے ہاں آجاتے، وہاں سے ہم دونوں مری روڈ پر ڈاکٹر گذدن مرحوم (ان کا انتقال ستمبر ۱۹۶۴ء میں ہوا) کے مطب پر دستک دیتے۔ فطرتؔ صاحب عموماً پہلے سے وہاں موجود ہوتے اور پھر ہم لوگ ڈیڑھ دو گھنٹے بازار کی گشت پر نکل پڑتے جس کا نام "چکوٹھی گشت" تھا۔ دوسرے احباب میں سے پروفیسر رزمی صدیقی مرحوم عزیز ملک ابوصالح، اصلاحی مرحوم اور پروفیسر کرم حیدری بھی اس گشت میں اکثر شریک

رہے۔ فطرتؔ صاحب اس گشت کا انتظار کچھ اس اشتیاق و بے چینی سے کیا کرتے تھے جیسے ماں بچے کا انتظار کرتی ہے۔ ناغہ ہو جاتا تو دوسرے دن ان کا فون آجاتا ـــــ کہ حضرت سلامت یہ کیا؟..... یہ کیوں؟ محبت و یگانگت کے اس ماحول میں ہم ایک دوسرے کو اصل ناموں سے کم ہی پکارتے تھے۔ مولانا عبدالعزیز فطرتؔ اس انجمن ناز و نیاز میں "فطرت عالی مقام" بلکہ صرف "عالی مقام" رہ گئے تھے۔

یہ ذاتی پس منظر میں نے قدرے تفصیل سے اسی لیے بیان کیا ہے کہ میں یہ تاثرات فطرتؔ صاحب کو محض سونگھ کر نہیں لکھ رہا، بلکہ سترہ اٹھارہ برس تک ان کو بہت قریب سے دیکھنے (چکھنے) کے بعد لکھ رہا ہوں۔ قرب بڑھتا ہے تو عموماً کشش گھٹ جاتی ہے۔ مگر فطرتؔ صاحب معمولی آدمی نہ تھے۔ اُن سے قرب جتنا بڑھتا، ان کے واسطے پیار اور تکریم کا جذبہ بڑھتا ہی چلا جاتا ـــــ اخلاص، ایثار، انکسار، قناعت اور خودداری کی صفات نے ان کی ذات میں ایک عجیب کشش پیدا کر دی تھی۔

وہ اُردو زبان کے محض ادیب و شاعر ہی نہ تھے اس کے پرستار بھی تھے۔ ان کے اس ذوق و شوق کی طرف سرسری سا اشارہ پہلے کر چکا ہوں۔ جن لوگوں نے ان کے ادبی اجتماعات دیکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے ذوق و نظر کی دلآویزی و دلنوازی کو کس طرح رنگ و خوشبو بنا کر محفل کے در و بست میں پھیلا دیتے تھے ذہانت، نفاست، شگفتگی اور محنت کی جو چمک ان کی طبیعت میں موجود تھی، وہی ان کی محفلوں میں نمایاں تھی۔ ان کو مشاعروں کا انتظام کرتے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے یہ شخص شعر کی پوجا کر رہا ہو۔ اسی خلوص کا اعجاز تھا کہ دلوں کو جلا دینے والی جو خالص تہذیبی و ادبی فضا عبدالعزیز فطرتؔ کی سجائی ہوئی محفلوں میں نظر آتی تھی یہ رنگ مالا انہیں محفلوں کا مقدر تھی۔

بڑے مشاعروں کے موقعوں پر، باقاعدہ مشاعرہ تو ایک ہی شب کا ہوتا، مگر "سدا بہار" (ان کے مکان) میں شاعری کے رتجگے کئی کئی رات برپا رہتے۔ شعر، چائے، لطیفے، قہقہے

وہ ہما ہمی ہوتی کہ اچھی خاصی شادی کی تقریب کا گمان ہونے لگتا۔ مہمانوں کی خاطر مدارات میں ان کی دلی خوشی، چاندنی بنکر ان کی آنکھوں سے چھلکنے اور ماتھے پر چمکنے لگتی۔ خود دوڑے دوڑے پھر رہے ہیں۔ یوسف، رفیق اور ایوب محسن ان کے بھائی۔ ظفر اور صفدر ان کے بیٹے، ہر وقت کمک پر کمربستہ رہتے، اور آپ وقفہ بہ وقفہ، مہمانوں کو نئی سے نئی کوئی نعمت کھلانے کے لیے نئے سے نئے بہانے تراشتے چلے جاتے کہ ذرا دیکھیے پشاور سے بشیر نے کچھ انگور بھیجے ہیں۔ یہ گرما کوئٹہ سے تحفے میں آیا ہے۔ یہ آم ...... یہ گلاب جامن ...... وہ خود بھی خوش خور تھے مگر میرا احساس ہے کہ جتنی راحت وہ دوسروں کو کھلانے میں محسوس کرتے تھے اتنی آسودگی خود کھانے میں شاید ہی محسوس کرتے تھے۔ مشاعرے تو مشاعرے "سدا بہار" کی محفلیں یوں بھی سدا بہار تھیں۔ جب بھی وہاں گئے، سخنوروں اور سخن دوستوں کا میلہ بھرا ہوا پایا۔ دنیائے شعر و ادب کے جتنے مشاہیر راولپنڈی میں عبدالعزیز فطرتؔ کے ہاں قیام کرتے رہے ہیں، یہ امتیاز شاید ہی کسی دوسرے فردِ واحد کے حصے میں آیا ہو ـــــ راولپنڈی میں اگر کسی مکان کو "کعبۂ سخن" کا نام دیا جا سکتا ہے تو وہ اسی عالی مقام کا گھر تھا۔

فطرتؔ بے انتہا مصروف شخص تھے۔ دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ ذوق و ضرورت کے مختلف رشتوں سے ان کی ذات کے گرد، دراصل دوستوں کے کئی مختلف حلقے پھل پھول رہے تھے۔ یہ ان کے ظرف ایثار و مروت کی وسعت تھی، کہ فطرتؔ صاحب ہر حلقے کی زندگی اور آبرو سمجھے جاتے تھے۔ برادری و رشتہ داری کا سلسلہ اس سے بھی زیادہ وسیع تھا۔ جس کی شادی۔ غمی، مسائل و معاملات کے خیال کو وہ ہر وقت سینے سے لگائے رکھتے تھے۔ ان کی ملازمت سخت تھکا دینے والی تھی۔ فرائضِ منصبی کو وہ اس تندہی دیانتداری اور ذمہ داری سے انجام دیتے کہ ڈاک خانے میں انسپکٹر ڈاکخانہ جات کے سوا کچھ اور معلوم ہی ہی نہ ہوتے۔ ذمہ دار شوہر، شفیق باپ، مخلص دوست، اعزہ و اقربا سے دلی رابطے اور

اپنے دل میں انسانوں کی ہمدردی اور خدمت کا وسیع جذبہ رکھنے والے عبدالعزیز فطرت کا ایک ایک لمحہ مصروفیت میں پرویا رہتا تھا ذاتی تفکرات اور محرومیوں سے ان کا دل خالی نہ تھا۔ مگر کوئی چیز بھی ان کی طبعی خوش دلی، خوش کلامی، خوش سوادی پر کبھی غالب نہ آسکی۔ مسرت کی تلاش اور مسرت سے لطف اندوزی ان کی زندگی کا اسلوب خاص تھا۔ میں نے ان کو کبھی آزردہ نہیں دیکھا۔ نہ کبھی کسی کی شکایت ان کی زبان سے سنی۔ اپنے بچوں، اپنے بھائیوں، اپنے دوستوں، اپنے رشتہ داروں کی باتیں وہ اس شگفتگی سے کیا کرتے کہ گویا ایک ایک بوند سے مسرتوں کا دریا کشید کر رہے ہوں۔ بڑے تو بڑے وہ چھوٹوں کا بھی ادب کرتے۔ بزرگ وہ کسی کے تھے ہی نہیں وہ سب کے دوست تھے ــــــ ہمہ شفقت ــــــ ہمہ ملائمت ــــــ ہمہ شگفتگی!

ننھے بچوں سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ عزیزوں کے بچے انکے گھر آتے تو اندر ممانیوں خالاؤں سے زیادہ بیٹھک میں انہیں سے چمٹے رہتے۔ آپ ان سے باقاعدہ بچوں کی طرح کھیلتے کہانیاں بیان کرتے، تالیاں بجاتے قہقہے لگاتے۔ بچوں کے لیے جیب میں کوئی نہ کوئی "چیجی" ڈالے رکھتے۔ گلی محلے میں ان کا نکلنا دشوار تھا۔ دہلیز سے باہر نکلے نہیں کہ چاروں طرف سے بچوں کا تانا کرتا ہوا غول ان سے آکر لپٹ جاتا۔ کہانی سناؤ جی! کاغذ کی کشتیاں بناؤ جی! بے تکلفی کا یہ عالم کہ آپ نے بچوں کے اور بچوں نے آپ کے عجیب عجیب ہنسا دینے والے نام رکھے ہوئے تھے۔ آپ اس پر خوب خوش ہوتے۔

وہ بڑے اونچے مرتبے کے ادیب اور وسیع شہرت کے شاعر تھے۔ نخوت تو خیر کیا معنی کرختگی یا سرد مہری کا بھی کوئی سایہ تک ان میں موجود نہ تھا۔ ادعا یا تعلی سے سخت کراہت ادبی اجتماعات میں امتیاز کی نشستوں سے دُور بھاگتے۔ کیا چھوٹا کیا بڑا سب کی تعظیم، سب کا لحاظ۔ سب کے لیے کلمۂ خیر، اپنا کلام ازروئے انکسار ہمیشہ تامل سے سناتے۔ اپنے شعر یاد بھی کم ہی رہتے، دوسروں کا کلام شوق و اصرار سے سنتے۔ اچھے شعر پر تڑپ اٹھتے اچھے شعر اور اچھی

بات سننے کا ان سے زیادہ مشتاق گاہک میری نظر سے نہیں گزرا۔

چائے اور میٹھے کے رسیا تھے۔ البتہ نفاست کا خیال ضرور رکھتے۔ چائے عمدہ ہوتی تو گھونٹ گھونٹ واری قربان ہو کر پیتے۔ مٹھائیوں کی سیرت پہ بھی فریفتہ تھے اور ان کی صورت کے بھی غلام تھے اور اس حد تک کہ مثلاً اگر لڈو یا امرتی کی شکل غیر متناسب ہوتی تو رغبت کم ہو جاتی تھی۔ ان کی نظر شاید ہر چیز میں فن کے جمالیاتی اور ذوقی تناسب کی متلاشی رہتی تھی ـــــ شہر میں مٹھائی کے جس استاد کا شہرہ ان تک پہنچتا، وہ خواہ کسی تنگ و تار کوچے میں خوانچہ لگا کر بیٹھتا ہو، آپ اس تک ضرور پہنچتے ـــــ اس معاملے میں ان کا شیوہ "سخن فہمی" کا تھا، غالب کی طرفداری کا نہ تھا، ہماری "چکو تھی گشت" میں مٹھائی خریدنے کا قلمدان انہیں کے سپرد تھا۔ آپ مٹھائی کا ڈبہ لے کر موٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھ جاتے اور دانہ دانہ نکال کر مفصل مقدمے اور دیباچے کے ساتھ، ہمیں کھلاتے جاتے۔ مٹھائی کی کسی دکان کے سامنے سے تانگہ جھانکے بغیر چپ چپاتے گزر جانا ان کے واسطے سخت کٹھن مرحلہ ہوتا ـــــ آخری دو برسوں میں جب ڈاکٹروں نے ذیابیطس کی وجہ سے میٹھا بند کر دیا۔ حسرت سے کہا کرتے ـــــ مٹھاس بند ہو جانے سے زندگی سے مٹھاس نکل گئی ہے ـــــ پرہیز کے احساس اور تاکید کے باوجود بعض اوقات اعلیٰ سیرت و صورت کی مٹھائی دیکھ کر آپ بے قابو ہو جاتے اور پتہ نہیں کس شاعر کا یہ شعر پڑھ کر دو چار دانوں پر ہاتھ صاف کر ہی جاتے ؎

اب کیا سنور سکیں گے ہم آوارگانِ شوق

صدیوں کے جبر نے تو سنوارا نہیں ہمیں،

فطرت صاحب عادتاً کارفرما اور منتظم آدمی تھے۔ مگر ملنساری، مروت اور بیگار کی مصروفیتوں کے سبب سے گھر کے دھندوں پہ توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اپنی زندگی میں اپنا کلام بھی مرتب نہ کر سکے۔ کبھی کسی گھریلو کام میں مصروف ہوتے تو سخت بیزاری کے موڈ میں پائے جاتے۔ دوستوں سے معذرت کرتے یارو! ایک منٹ معاف

کرنا ہیں، ابھی اس جنجال کو ختم کرتا ہوں مالی لحاظ سے وہ ہمیشہ ناآسودہ رہے۔ مگر اپنی آزردگی کو کبھی انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ صحیح معنوں میں شاکر اور قانع انسان تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے ایک دوکان بھی کھولی۔ عمارتی لکڑی کے تختے کرائے پر چلانے کا منصوبہ تھا۔ اصغر مال کے قریب ایک وسیع احاطے میں تختوں کا انبار جمع کر لیا تھا۔ ایک روز ان کی تلاش میں ہم پہنچے تو دیکھا کہ پیڑوں کے ایک جھنڈ پر براق سفید چادر کا پلنگ بچھا ہوا ہے ساتھ دو تین کرسیاں رکھی ہیں اور آپ بے رنگ، خشک تختوں کے سامنے شاداب گملوں کی قطار آراستہ کر رہے تھے ہنس کر بولے کاروبار اپنی جگہ پہ ہوتا رہے گا۔ میں نے سوچا نشست کے لیے ذرا ڈھنگ کی جگہ تو بن جائے۔ تختے چل بھی نکلے تھے مگر اتنی دور چلے گئے تھے کہ تھوڑے ہی دنوں میں دکان کا تختہ ہو گیا۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ گاہک عموماً واقف کار لوگ تھے جن سے کرائے کا تقاضا کرتے ہوئے آپ کو شرم آتی۔ کسی بات کا تقاضا کرنا فطرت کے تقاضائے فطرت کے خلاف تھا۔ وہ عمر بھر جد وجہد تو کرتے رہے مگر تقاضا کبھی نہ کر سکے۔

مارچ ۱۹۶۵ء میں راولپنڈی کے ادیبوں اور شاعروں نے ان کی ساٹھویں سالگرہ پر "جشنِ فطرت" کے عنوان سے ایک دھوم دھامی تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب کو وہ چھ سات برس سے ٹالتے چلے آرہے تھے۔ نیازمندوں نے گھیر گھار کر مجبور کیا تو بس اس حد تک راضی ہوئے کہ اچھا میں آجاؤں گا۔ لیکن کسی مشورے میں ہرگز شامل نہ ہوں گا۔ تقریب کے سلسلے میں انہوں نے صرف ایک فرمائش کی تھی۔ کہنے لگے۔ فلاں محلے میں میرا ایک غریب دوست رہتا ہے وہ کوران پڑھ آدمی ہے مگر میرے بچپنے کا جگری دوست ہے تقریب میں اس کو ضرور بلوائیے تقریب کے دن صبح ان سے ملاقات ہوئی تو دھوم دھام کے احساس سے ان پر سخت وحشت طاری تھی ہمیں اندیشہ تھا کہ مبادا عین وقت پر آپ تقریب میں شرکت سے انکار کر دیں اور اگر ایفائے عہد ان کی سرشت کا خاصہ نہ ہوتا تو کچھ عجب نہیں کہ وہ جلسے

سرے سے تشریف ہی نہ لاتے۔

سفر میں ان ایسا خوشگوار ساتھی مشکل سے ملے گا۔ ان کی شاداب باتوں اور چست چٹکیلے
بلوں سے سفر ایک دلکشا ادبی تفریح بن جاتا۔ ساتھیوں کی دیکھ بھال اور ان کے ڈسپلن
باگ ڈور انہی کے ہاتھ میں ہوتی۔ ڈیرے پر جاکر جب تک ایک ایک چیز کو جا بجا
رینے سے جما کر رکھ نہ لیتے، آرام نہ کرتے۔ صبح کی چائے کا انتظام رات ہی سے کر رکھتے۔
خیز تھے۔ رات کے تین بجے بھی سوتے تو پانچ بجے اٹھ بیٹھتے مناظر فطرت سے عشق تھا۔
ٹھتے ہی باہر گھومنے نکل جاتے، شجر و حجر، جوئباروں اور شاخساروں سے نسیم صبح کے لہجے میں
لنگو فرماتے۔ شیو، غسل، نماز سے فارغ ہو کر، میز پر چائے کا سامان چن کر، پیار سے چھلکتے ہوئے
لہجے میں آواز دیتے۔

شیخ صاحب آئیے! آجائیے!

صفائی ستھرائی، طہارت کا بڑا خیال رکھتے ـــــ اچھے بھرپور غسل کو زندگی کی نعمتوں
میں شمار کرتے ـــــ صاف ستھرا غسلخانہ جہاں بھی مل جاتا فوراً نہانے کے لیے کمر کھولنے لگتے
لوگ کسی ہوٹل میں قیام کرتے تو آپ سب سے پہلے غسلخانے کا جائزہ لیتے۔ غسل خانہ اچھا
ہے تو ہوٹل پاس ورنہ فیل ـــــ ان کے بس میں ہوتا تو گرمیوں کا پورا موسم کسی اعلے
غسلخانے کے ٹب میں گزار دیا کرتے!

فطرت ہر لحاظ سے ایک خوش خط آدمی تھے۔ اپنے شعر کی طرح اپنے بستر پہ بھی ہلکی
سی شکن برداشت نہ کر سکتے۔ اس معاملے میں اس قدر ذکی الحس تھے کہ کسی دوسرے کے بستر
پہ شکن دیکھ لیتے تو سو نہ سکتے۔ سلیقہ اور ترتیب ان کا خاصا تھا۔ اپنی کتابوں کاغذوں اور
کپڑوں کو انتہائی ترتیب سے تہہ کر کے رکھتے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو پرانے رسائل و
جرائد کے تراشوں کے انبار کمروں کی چھتوں تک جا پہنچے۔

فطرت صاحب مذہب سے دلی اور گہری وابستگی رکھتے تھے وہ ایک راسخ العقیدہ اور

باعمل مسلمان تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے بے پناہ عشق تھا۔ مگر دین سے اپنے شغف کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھتے تھے۔ دکھاوے سے ان کو خوف آتا تھا۔ عمر کے آخری دور میں حج بیت اللہ اور روضۂ رسولِ کریم پر حاضری کی آرزو میں بے چین رہنے لگے۔ اشعار پر تقدیسی رنگ غالب آگیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں اللہ پاک نے ان کو اس سعادت سے بھی سرفراز کر دیا۔ حج سے واپس آئے تو چہرے پر چھوٹی چھوٹی پُر نُور داڑھی تھی۔ کہنے لگے۔ واپسی کی مجبوری تھی، اس لیے واپس آنا پڑا، ورنہ میری نہیں ہوتی ـــــ زندگی کی اس عزیز ترین آرزو کے بر آنے کے بعد غالباً ان کو زندگی کی مزید احتیاج باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اگست میں بیمار ہوئے۔ اور ۵ اکتوبر کے آفتاب کے ساتھ پوٹھوار کا یہ آفتاب بھی غروب ہو گیا۔

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

فطرت، زندگی میں بھی بلند مقام تھا۔ اب اور بھی بلند ہو گیا ہے!

اُردو ادب[1] کا منگلا ڈیم

احمد ندیم قاسمی اس دَور کی ایک اہم ادبی شخصیت ہیں۔ فردا ـــــــ حال سے کٹا ہوا نہیں، بندھا ہوا ہوتا ہے۔ ہر دَور میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ تاریخ اُن کی زندگی ہی میں، ان کی پائیدار عظمت کی نشاندہی کر دیتی ہے۔ ندیم انھی اہلِ قلم میں سے ہیں، جن کی روشنی حال سے نکل کر فردا میں جھلملا رہی ہے۔ ان کی آواز ہمارے دور کی نمائندہ آواز ہے جو دھڑکن اور روشنی بن کر زندگی کے دل میں اتر گئی ہے۔ ندیم کے بارے میں کچھ لکھنے کی نیت سے جب تک قلم اٹھایا نہ تھا، ان کے متعلق کچھ لکھنا سہل معلوم ہوا۔ مگر جب لکھنے بیٹھا تو یہ مرحلہ انتہائی دشوار نظر آیا۔ ذہن میں جھانکتا ہوں تو دُور، دُور تک، پھولوں اور ستاروں اور نغموں کا "میلہ چراغاں" بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے ندیم کی شخصیت پر جتنا غور کرتا ہوں اتنا ہی اس کا پیکر رنگوں اور خوشبوؤں میں تحلیل ہو کر فضا میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اے کاش۔ اس لطافت اور شیرینی کو کماحقہ بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ موجود ہوتے اور اگر موجود ہیں تو میری دسترس میں بھی ہوتے۔

زندگی میں مختلف اور مصروف راستوں پر چلنے کے سبب سے آرزو کے باوجود مجھے ندیم سے دوستی کی پینگیں بڑھانے کا موقع تو نہ مل سکا۔ لیکن میں ان سے محبت ضرور رکھتا ہوں یہ محبت چونکہ وصال سے زیادہ فراق کی راہوں سے گزرتی رہی ہے۔ لہٰذا اس کی شدت کا اندازہ میں ہی کر سکتا ہوں۔ جب میں پہلی مرتبہ ان سے بغلگیر ہوا تھا تو طبیعتیں پہلے ہی ایک

---

[1] یہ مضمون نومبر ۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ کالج راولپنڈی کی ایک تقریب کے لیے لکھا گیا تھا۔ آجکل زیرِ تعمیر تربیلا ڈیم مکمل ہونے پر منگلا ڈیم سے بڑا آبی ذخیرہ ہوگا۔ مگر میں نے مضمون کا عنوان تبدیل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ علامت کی معنویت ایک سی رہتی ہے (ض جنوری ۱۹۷۶ء)

دوسرے سے بغلگیر ہو چکیں تھیں، یہ ذات سے ذات اور محسوسات سے محسوسات کی ملاقات تھی توقع یہی تھی کہ اس پس منظر سے، ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر برآمد ہوں گے، اور زندگی کے راستے پر قدم سے قدم ملا کر چلیں گے لیکن دو قدم ہی چلے ہوں گے کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کے قدم جیل خانے کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ میں اپنی روٹی کے انتظام میں اور وہ دوسروں کی روٹی کے بندوبست میں اپنے اپنے راستوں پر مصروف ہو گئے۔

دہلی، لکھنؤ، حیدر آباد (دکن) کی وہ جانیں، لیکن پنجاب کے جتنے ادیب آج عمر کے لحاظ سے پچاس برس کے پیٹے میں ہیں، ان میں سے بیشتر آج سے کوئی تیس برس پیشتر پنجاب کے مختلف کالجوں میں تحصیل علم کے مختلف مرحلوں سے گزر رہے تھے اور ایک بات ان سب میں مشترک تھی کہ

جو ذرہ جس جگہ تھا وہاں آفتاب تھا

یعنی کالج کے ادبی حلقوں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔

ان میں سے بیشتر شعرا نے آگے چل کر زندگی کے سامنے قلم رکھ دیا جیسے کوئی سپاہی دشمن کے سامنے تلوار رکھ دے۔ ہمارے کالج (گورنمنٹ کالج کیمبل پور) میں ملک اختر حسین (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) شیر محمد شاد (بعد میں کرنل) اور بخشی انور علی انور (آج کل پرنسپل گورنمنٹ کالج مری) کا طوطی برابر برابر بول رہا تھا۔ ان میں سے اختر اور شاد ادب کا میدان چھوڑ کر جنگ کے میدان میں چلے گئے۔ سبز طوطی کی آواز سے کان موڑ کر انہوں نے دوسری جنگ عظیم میں جنگل گرین وردی (JUNGLE GREEN) پہن لی۔ البتہ بخشی انور علی انور کی پیش قدمی بفضل تعالیٰ اب تک محاذِ ادب پر جاری ہے۔ ہم لوگوں کی ادب سبھا کالج کی "ٹک شاپ" میں جما کرتی جہاں کبھی گرم کرارے سموسوں اور کبھی نرم ٹھنڈے شربتوں کے ساتھ ساتھ ادبی مسائل زیرِ بحث رہتے۔ ادبی مسائل میں عموماً مختلف کالجوں کے درس گاہی جریدوں کو، جو ہماری لائبریری میں بہت بھی آتے اور التزام سے بھی آتے۔ بطور خاص خوردبین لگا کر دیکھا

جاتا۔ ایک مرتبہ، سری پرتاپ سنگھ کالج سری نگر کے ایک شاعر بُلبُل کے اس شعر کا کئی روز تک تذکرہ ہوتا رہا۔

مرا نام گل ہے تخلص ہے بُلبُل
سلامٌ علیکم اُڑا چاہتا ہوں

احمد ندیم قاسمی کا غلغلہ پہلے پہل ہمارے ہاں ہماری اس ادب سبھا میں اُٹھا (یہ بعد میں پتہ چلا کہ وہ کیمبل پور میں زیر تعلیم بھی رہے)۔ ہوا یہ کہ ایک دن شاؔد صاحب ایک رسالہ اٹھا لائے (غالباً صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور کا میگزین تھا) جس میں سے انہوں نے ایک نظم اپنے ایک مخصوص جارحانہ ترنم میں پڑھ کر سنائی اور پھر دو ٹوک لہجہ میں فیصلہ صادر کرتے ہوئے بولے ——— اس کو کہتے ہیں عالم آرائی۔

یہ کسی پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کی نظم تھی۔ نظم میں دیہاتی زندگی کی اتنی خوبصورت اور سچی عکاسی کی گئی تھی کہ جیسے ایک ایک شعر کے چہرے پر خود میرے اپنے گاؤں کی سنہری دھوپ چمک رہی ہو پھر یہ نہیں کہ شاعر محض کیکر، پھلاہی، شہتوت کے درخت گنواتا چلا گیا ہو۔ یا کسی کسان کے ہاتھ میں حقہ تھما کر خود کسی نہر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا ہو۔ ایسا نہ تھا، نظم میں الھڑپنے کی معصومیت بھی تھی اور نوجوانی کی اُمنڈتی ہوئی طمانیت بھی۔ مگر اس کا ریشہ ریشہ زندگی کی دھڑکنوں سے تپا ہوا تھا، منظر کا جسم، جس قدر خوبصورت تھا۔ اس کی روح اتنی ہی دردمند تھی مجھے یاد ہے "ادب سبھا" میں کالج کے دانشوروں کی "ہندولابی" کے گورکھ منوہر لال دھوپر نے کہا تھا ——— "اس لوک کے شبد جنری بجلاتے ہوئے آتے ہیں۔" ہمیں جب کبھی کوئی غیر معمولی ادبی نعمت دستیاب ہوتی تو ہم لوگ اس کی قدر و قیمت پر مذاکرہ کرنیکی نیت سے ایک باقاعدہ وفد کی صورت میں پروفیسر مولوی انعام علی بیگ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے کیمبلپور میں مذاق شعر و ادب کی آخری مہر انہیں کے پاس سمجھی جاتی تھی۔ آج بھی ہم اس نظم کا جلوس باندھ کر ان کے پاس پہنچے۔ مولوی انعام علی بیگ عربی کے استاد اور فارسی کے شاعر تھے۔ ایک دو

غزلیں اردو میں بھی کہہ رکھی تھیں ادبیات پر ان کے نقد و نظر کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ نظم یا غزل سن کر کوئی لمبی چوڑی بحث اٹھانے کے بجائے کوئی ایک عارفانہ سا جملہ کہہ دیتے جس کی تعبیر و تفسیر آپ اپنی توفیق کے مطابق خود کرتے رہیے۔ مولوی صاحب کے سامنے نظم کی خواندگی کا فریضہ شادؔ صاحب نے اپنے مخصوص ترنم میں ادا کیا۔ ترنم کے بعد مولوی صاحب نے وہ نظم دوسری مرتبہ تحت اللفظ میں سماعت فرمائی۔ کیونکہ ان کے بقول شعر کی قدر و قیمت کا اندازہ ترنم سے نہیں، تحمّل، تعمق، تفکر وغیرہ سے ہوتا تھا۔ شادؔ پڑھ چکے، تو مولوی صاحب نے رسالہ اپنے ہاتھ میں لے کر ایک مرتبہ پوری نظم کو، دل ہی دل میں، چبا چبا کر خود پڑھا پھر کچھ دیر آنکھیں بند کر کے اپنے اندر دیکھتے رہے، پھر دائیں بائیں سر ہلانے کے بعد ارشاد فرمایا:

"یہ گھوڑا اگر دوڑتا رہا تو ریس (RACE) جیت جائے گا۔"

اس کے بعد پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کی جو چیز جہاں بھی نظر آتی ہم لوگ اس کو "ٹک شاپ" میں باجماعت پڑھتے خوبیوں کے علاوہ ان کے شعروں میں سے "کیڑے" پکڑنے کی بھی بہت کوشش کرتے مگر عموماً ہر نظم کے بعد مولوی انعام علی بیگ صاحب کو جا کر یہ اطلاع دینا پڑتی۔

"جناب آپ کو گھوڑا بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے۔"

اور مولوی صاحب یہ سن کر ایسی مسکراتی ہوئی نگاہوں سے ہمیں دیکھتے جیسے فی الواقع انہیں کا گھوڑا دوڑ رہا ہو ـــــ قاسمی صاحب کی چیزیں زیادہ تر دور افتادہ ضلعی پرچوں میں نظر آتیں ـــــ دھوپہ اگرچہ ہندو تھا۔ مگر چونکہ میانوالی میں پلا بڑھا تھا، اس لیے پنڈت تلوک چند محرومؔ کی معنوی اولاد معلوم ہوتا تھا۔ یعنی فارسی اردو میں ڈھلا ہوا ہندو۔ ایک روز دھوپہ ایک نیا رسالہ اٹھا لایا، اور رسالے کو ہلاتے ہوئے بولا۔

"ایں گلِ دیگر شگفت! ـــــ ذرا یہ کہانی دیکھو" ـــــ یہ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی

افسانہ تھا۔ بصیرت کی اس وقت نہ ہمیں خبر تھی نہ ضرورت ۔ ہم تو لذت، کشش اور تاثر
گاہک تھے، سو یہ سب نعمتیں ان کے افسانے میں بڑے ہی پیارے توازن اور بانکپن کے
تھ موجود تھیں۔ بصیرت پیچھے پیچھے خود بخود چلی آئی تھی۔ شعر کی طرح ان کی نثر بھی سیدھی دل
جاکر ترازو ہوتی۔ کہانی میں کپاس کے ہنستے ہوئے پھولوں کے درمیان روتی ہوئی زندگی
کوئی مرقع پیش کیا گیا تھا۔ افسانے کے اکثر کردار ہمیں اپنے ہی رشتہ دار معلوم ہوتے
۲۶ - ۱۹۲۵ء کی بات ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ دو ایک برس بعد میں ندیمؔ کو چھو کر
دیکھ لوں گا یہ ۳۲ء یا ۳۳ء کا واقعہ ہے، ندیمؔ شہرت کے زینے تیزی سے طے
رہے تھے، میں اسلامیہ کالج لاہور کے ریواز ہوسٹل میں رہتا تھا۔ جہاں ایک طرف
ار صدیقی، اختر ہوشیار پوری، اور تابش صدیقی ایسے طلباء شاعر مقیم تھے جو آگے جا کر
اہیر ادب میں شمار ہوئے وہاں دوسری طرف جہلم، سرگودھا اور میانوالی کی طرف کے
اس توانا و تندرست، فٹ بال اور کبڈی کے کھلاڑی طلبا کا بڑا "ڈپو" (DEPOT) قائم
۔ شاعر طبع ہونے کے باوجود چونکہ میں تن و توش اور لباس کی وضع و تراش نیز عام نشست
برخاست میں انہی طلبہ کا ہم سخن و ہم قدم تھا، لہٰذا ادب و شعر کے معروف حلقوں کی
ف ہمارا اگزر کم ہوتا۔ طلبہ کا یہ گروہ طرّے دار پگڑیاں باندھتا، اور لمبی لمبی اچکنوں کے
تھ تنگ مہری کی بھاری، تہہ دار چُنی ہوئی شلواریں پہنا کرتا۔ مونچھیں اگر نکل آئی تھیں
ہم لوگ ان کو واپس نہیں جانے دیتے تھے۔ ہمارا زیادہ وقت گھی پی کر ورزش کرنے۔
رکلی میں گھومنے گھامنے یا کسی نہ کسی شاخسانے میں الجھ کر ہاتھا پائی، مار کٹائی وغیرہ کے
غلوں میں گزرتا۔ عجیب بات ہے کہ ندیمؔ سے میری پہلی ملاقات کسی "حلقۂ سخنوراں" میں
ں ہوئی۔ بلکہ اس "حلقۂ بیل تناں" میں ہوئی۔ وہ ایک روز ریواز ہوسٹل میں مقیم پانچ
نیازیوں سے ملنے آئے تو اس نرغے میں مجھ سے بھی ملاقات ہو گئی، سہ پہر ڈھلنے پر
ب انارکلی میں ستاروں کے اترنے کا وقت ہوا، تو نیازیوں کا جتھا، طرّے لہراتا شلواریں

کھڑکھڑاتا انارکلی کی یلغار پر نکل گیا۔ مگر میں اور ندیم دیر تک بیٹھے ادب و شعر کی باتیں کرتے رہے۔ ندیم ابھی تک پیرزادہ احمد ندیم قاسمی تھے شاعر کا نام اس وقت سکڑتا ہے جب اس کی شہرت پھیلنے لگتی ہے۔ وضع قطع وہی تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ گاؤں کا ٹھیٹھ نوجوان جیسے اپنی کسی نظم یا افسانے میں سے ابھی ابھی نکلا ہو۔ لباس سادہ مگر ستھرا۔ خلوص۔ سچائی اور انکسار کا پیکر۔ بیٹھا میٹھا دھیما سا لہجہ، بات ٹھہر ٹھہر کر سوچ سوچ کر گویا کوئی لفظ ادا کرنے سے قبل اس کی ذمہ داری بھی قبول کر رہے ہوں۔ چہرے پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ۔ آنکھوں میں وہ غیر معمولی چمک جو مروّت، ہمدردی اور خوش خیالی کے جذبے اور افق پار کسی چیز کی مسلسل تلاش کی کاوش سے پیدا ہوتی ہے اور ہاں رخسار پر زخم کا وہ نشان بھی، جو ندیم کی شخصیت کا "قومی نشان" ہے، ان کے خد و خال کی کشش کو تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ بیان کرنا مشکل ہے۔ ہاں مجموعی طور پر ان کو دیکھ کر ایک مردانہ جاذبیت اور شریفانہ وقار کا احساس ہوتا تھا۔ بعد میں جیسے جیسے ان کا فن نکھرتا گیا، ان کے لباس میں بھی نفاست اور سلیقے کا رکھ رکھاؤ سنورتا چلا گیا۔ ندیم شاعری کے علاوہ زندگی میں بھی کام آنے والے ایک صحت مند، خوش ذوق، صاف ستھرے انسان ہیں۔

ندیم ان دنوں کالج سے تازہ تازہ نکلے تھے۔ اور دو ایک سرکاری ملازمتوں کو سونگھ سانگھ کر، اب لاہور میں اپنی پسند و مذاق کا کوئی کام تلاش کر رہے تھے ادبی حلقوں میں اگرچہ ان کی شہرت تیزی سے پھیل رہی تھی۔ تاہم لاہور میں وہ ابھی نو وارد تھے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس عظیم شہر میں جناب مولانا غلام مرشد یا دیواز ہوٹل کے "چند نیاز مندوں" کے سوا وہ کسی شخص سے متعارف نہیں ہیں۔ گویا جہاں تک لاہور کی زندگی کا تعلق تھا۔ میں ندیم سے سینئر تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے تو اپنی پرواز خیال کے مطابق، ان کو سرکاری ملازمت ترک کرنے پر ایک طرح کی سرزنش کی کہ پیارے یہ تو نے بُرا کیا کیونکہ ادب میں روٹی نہیں ملتی۔ پھر ادب کے میدان میں ان کو مشورہ دیا کہ بھائی صاحب یہاں کے ایڈیٹروں سے کچھ راہ و رسم نکالو۔ یہ لوگ شعر نہیں واقفیت چھاپتے ہیں۔ مجھے یاد ہے، ندیم نے مسکرا کر

جواب دیا تھا ـــــ "میرے شعر میں جان ہو گی تو چھپ جائے گا، ورنہ اس کا نہ چھپنا ہی بہتر ہے" یہ جواب سن کر مجھے شاید ایک جھرجھری سی بھی آئی اور دل میں شاید کچھ ہنسی بھی۔ مجھے اس وقت اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ دور افتادہ جگہ میں اُگا ہوا یہ سادہ سا نوجوان ایک روز لاہور شہر کے دل پر حکومت کریگا اور اردو ادب کا ایک پورا دور اس کے نام اور کام سے روشنی پائے گا۔

لاہور کی ادبی زندگی میں ان دنوں ابو الاثر حفیظ جالندھری اور شاعرِ رومان حضرت اختر شیرانی کا طوطی بول رہا تھا۔ حفیظ صاحب کوٹھیوں میں رہتے اور موٹروں میں گھومتے اور یوں بھی کچھ باقاعدہ سے، کچھ لیے دیئے سے، دور کے ڈھول بعض اوقات غلط بھی سنائی دیتے ہیں۔ ہم نے از خود یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم حفیظ کے آدمی نہیں اختر کے آدمی ہیں۔ شاعرِ رومان ایک تو ویسے ہی نوجوان نسل کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ پھر کالج کے آس پاس کے گلی کوچوں میں جھومتے جھامتے مل جاتے اور اللہ بخشے پہلی ملاقات ہی میں غیریت کا پردہ چاک کرکے الگ پھینک دیتے۔ ان سے ملاقات سہل بھی تھی اور خوشگوار بھی مجھ سے پہلے تابش صدیقی ان کے راسخ مریدوں میں شامل ہو چکا تھا۔ میں بھی تابش کے وسیلے سے ان کے حلقے میں پہنچا۔ وہ اپنے نامور والد علامہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے ساتھ فلیمنگ روڈ کی ایک دو تین منزلہ حویلی میں رہتے تھے جو ایک احاطے کے اندر واقع تھی پہلی منزل سے بھی پہلے، ایک تنگ نیم تاریک سی بغلی کوٹھڑی میں ان کی نشست رہتی۔ خواب گاہ بھی یہی تھی۔ ایک چارپائی پر بستر، سامنے میز پر رسالہ رومان کا دفتر اور حجامت کا سامان ملاقاتی بھی یہیں آکر ان سے اپنے اپنے حسن یار کی باتیں کرتے۔ ندیم سے ان کے ہاں کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی۔ اختر کی محفل میں چونکہ بندہ و صاحب و محتاج و غنی۔ بالکل ایک ہو جاتے تھے۔ اس لیے ان کے بعض چھوٹے چھوٹے نیاز مند بھی ان کے سامنے گفتگو میں خاصی بے تکلفی کا انداز اختیار کر لیتے۔ ندیم غالباً واحد نوجوان تھے جو اختر کے حضور میں سرتاپا ادب کا مرقع بنے، خاموش

بیٹھے رہتے ۔ اختر اگر خاص طور پر ان سے کوئی بات پوچھتے تو جواب میں کوئی جچی تلی بات کہہ
دیتے ۔ جو چمکیلی بھی ہوتی اور اطلس ، کمخواب میں لپٹی ہوئی بھی ، ورنہ گھنٹوں بیٹھے رہتے اور
وہی ——جی جناب ...... بہت اچھا ...... بجا ارشاد فرمایا —— کی سرحد سے آگے
تجاوز نہ کرتے ۔ اختر کے نیاز مندوں میں سب سے زیادہ سنجیدہ سب سے زیادہ مؤدب
اور پارسا ندیمؔ ہی تھا ۔ یوں لگتا جیسے وہ اختر شیرانی کو دیکھنے ، ان کی باتیں سننے ، ان کی دیکھ
بھال کرنے کی غرض سے وہاں کسی "ادبی یاترا" پر آئے بیٹھے ہوں ۔ ندیم کی اس ادا میں عبادت
کی سی پاکیزگی ، خلوص اور لگن کا انداز ملتا ۔

اختر شیرانی بھی ان کو بہت عزیز رکھتے ۔ محبت تو وہ بھی سے کرتے ، لیکن ندیمؔ کی عزت
بھی کیا کرتے ۔ ندیمؔ کبھی لاہور سے باہر ہوئے اور ان کا خط آگیا تو اختر ان کے خط کو ، ایک
قلبی لطف کے لگاؤ کے ساتھ ، اپنے احباب اور نیاز مندوں کو سنایا کرتے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ
نوجوان پیرزادہ احمد ندیمؔ قاسمی کے اخلاص و اخلاق کا یہ پرتو اس کی شخصیت کے ایک بہت
ہی اہم رُخ کی ترجمانی کرتا ہے ۔ میری رائے میں ندیم کی وسیع انسانی ہمدردی اس کے دل و نگاہ
کی روشنی اور بصیرت ، اس کی دردمندی اور دل نوازی نے جو اس کے عظیم فن کا امتیاز
خاص ہیں ، ندیم کی اعلیٰ سیرت ہی سے جنم لیا ہے یہ روشنی اس کی خود کشید ہے !

اس اثناء میں ، لاہور سے جب میرا آب و دانہ اٹھا تو کوئی دس بارہ برس کی مدت
کے بعد دوسری جنگِ عظیم میں سے گزرتا ہوا راولپنڈی میں آکر بیٹھا ۔ اب کبھی کبھار ندیمؔ سے
"روزنامہ امروز" کے دفتر میں (پیر و مرشد) مولانا چراغ حسن حسرت کی بارگاہ میں ملاقات ہو
جاتی ۔ مولانا حسرت "امروز" سے رخصت ہوئے تو اخبار کی کرسی ادارت ندیمؔ کو تفویض ہوئی
اس عرصے میں ندیم کی شہرت و عظمت کا آفتاب افق پر کئی نیزے بلند ہو چکا تھا ۔ وہ ایک بلند
پایہ شاعر ، منفرد افسانہ نگار ، بالغ نظر نقاد ، اور ایک باکمال صحافی اور انشاء پرداز کی حیثیت
سے مانے جا چکے تھے ان کی ریڈیائی نگارشات کی دھوم تھی ۔ ان کے فکاہی کالم کی خوشبو دور دور

افسانہ تھا۔ بصیرت کی اس وقت نہ ہمیں خبر تھی نہ ضرورت۔ ہم تو لذّت، کشش اور تاثر
گاہک تھے، سو یہ سب نعمتیں ان کے افسانے میں بڑے ہی پیارے توازن اور بانکپن کے
تھ موجود تھیں۔ بصیرت نیچے نیچے خود بخود چلی آئی تھی۔ شعر کی طرح ان کی نثر بھی سیدھی دل
جا کر ترازو ہوتی۔ کہانی میں کپاس کے ہنستے ہوئے پھولوں کے درمیان روتی ہوئی زندگی
کوئی مرقع پیش کیا گیا تھا۔ افسانے کے اکثر کردار ہمیں اپنے ہی رشتہ دار معلوم ہوئے
۲۶ - ۱۹۲۵ء کی بات ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ دو ایک برس بعد میں ندیمؔ کو چھو کر
دیکھ لوں گا یہ ۳۲ء یا ۳۳ء کا واقعہ ہے، ندیمؔ شہرت کے زینے تیزی سے طے
رہے تھے، میں اسلامیہ کالج لاہور کے ریواز ہوسٹل میں رہتا تھا۔ جہاں ایک طرف
صدیقی، اختر ہوشیار پوری، اور تابش صدیقی ایسے طلبا، شاعر مقیم تھے جو آگے جا کر
اہیر ادب میں شمار ہوئے وہاں دوسری طرف جہلم، سرگودھا اور میانوالی کی طرف کے
س توانا و تندرست، فٹ بال اور کبڈی کے کھلاڑی طلبا کا بڑا ڈپو "(DEPOT)" قائم
۔ شاعر طبع ہونے کے باوجود چونکہ میں تن و توش اور لباس کی وضع و تراش نیز عام نشست
خواست میں انہی طلبہ کا ہم سخن و ہم قدم تھا، لہٰذا ادب و شعر کے معروف حلقوں کی
ف ہمارا گزر کم ہوتا۔ طلبہ کا یہ گروہ طرے دار پگڑیاں باندھتا، اور لمبی لمبی اچکنوں کے
تھ تنگ موہری کی بھاری، تہہ دار چُنی ہوئی شلواریں پہنا کرتا۔ مونچھیں اگر نکل آئی تھیں
ہم لوگ ان کو واپس نہیں جانے دیتے تھے۔ ہمارا زیادہ وقت گھی پی کر ورزش کرنے۔
کلی میں گھومنے گھامنے یا کبھی نہ کبھی شاخسانے میں الجھ کر ہاتھا پائی، مار کٹائی وغیرہ کے
لمول میں گزرتا۔ عجیب بات ہے کہ ندیمؔ سے میری پہلی ملاقات کسی "حلقۂ سخنوراں" میں
ں ہوئی۔ بلکہ اس "حلقۂ فیل تناں" میں ہوئی۔ وہ ایک روز ریواز ہوسٹل میں مقیم پانچ
نیازیوں سے ملنے آئے تو اس نرغے میں مجھ سے بھی ملاقات ہو گئی، سہ پہر ڈھلنے پر
ب انارکلی میں ستاروں کے اترنے کا وقت ہوا، تو نیازیوں کا جتھا، طرے لہراتا شلواریں

کھڑکھڑاتا انارکلی کی یلغار پر نکل گیا۔ مگر میں اور ندیم دیر تک بیٹھے ادب و نثر کی باتیں کرتے رہے۔ ندیم ابھی تک پیرزادہ احمد ندیم قاسمی تھے شاعر کا نام اس وقت سکڑتا ہے جب اس کی شہرت پھیلنے لگتی ہے۔ وضع قطع وہی تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ گاؤں کا ٹھیٹھ نوجوان جیسے اپنی کسی نظم یا افسانے میں سے ابھی ابھی نکلا ہو۔ لباس سادہ مگر ستھرا۔ خلوص۔ سچائی اور انکسار کا پیکر۔ میٹھا میٹھا دھیما سا لہجہ، بات ٹھہر ٹھہر کر سوچ سوچ کر گویا کوئی لفظ ادا کرنے سے قبل اس کی ذمہ داری بھی قبول کر رہے ہوں۔ چہرے پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ۔ آنکھوں میں وہ غیر معمولی چمک جو مروت، ہمدردی اور خوش خیالی کے جذبے اور افق پار کسی چیز کی مسلسل تلاش کی کاوش سے پیدا ہوتی ہے اور ہاں رخسار پر زخم کا وہ نشان بھی، جو ندیم کی شخصیت کا "قومی نشان" ہے۔ ان کے خد و خال کی کشش کو تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ بیان کرنا مشکل ہے۔ ہاں مجموعی طور پر ان کو دیکھ کر ایک مردانہ جاذبیت اور شریفانہ وقار کا احساس ہوتا تھا۔ بعد میں جیسے جیسے ان کا فن نکھرتا گیا، ان کے لباس میں بھی نفاست اور سلیقے کا رکھ رکھاؤ سنورتا چلا گیا۔ ندیم شاعری کے علاوہ زندگی میں بھی کام آنے والے ایک صحت مند، خوش ذوق، صاف ستھرے انسان ہیں۔

ندیم ان دنوں کالج سے تازہ تازہ نکلے تھے۔ اور دو ایک سرکاری ملازمتوں کو سونگھ ساگھ کر، اب لاہور میں اپنی پسند و مذاق کا کوئی کام تلاش کر رہے تھے ادبی حلقوں میں اگرچہ ان کی شہرت تیزی سے پھیل رہی تھی۔ تاہم لاہور میں وہ ابھی نو وارد تھے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس عظیم شہر میں جناب مولانا غلام مرشد یا دیواز ہوسٹل کے "چند نیازیوں" کے سوا وہ کسی شخص سے متعارف نہیں ہیں۔ گویا جہاں تک لاہور کی زندگی کا تعلق تھا۔ میں ندیم سے سینئر تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے تو اپنی پرواز خیال کے مطابق، ان کو سرکاری ملازمت ترک کرنے پر ایک طرح کی سرزنش کی کہ پیارے یہ تو نے بُرا کیا کیونکہ ادب میں روٹی نہیں ملتی۔ پھر ادب کے میدان میں ان کو مشورہ دیا کہ بھائی صاحب یہاں کے ایڈیٹروں سے بھی کچھ راہ و رسم نکالو۔ یہ لوگ شعر نہیں واقفیت چھاپتے ہیں۔ مجھے یاد ہے، ندیم نے مسکرا کر

جواب دیا تھا ــــــ "میرے شعر میں جان ہوگی تو چھپ جائے گا، ورنہ اس کا نہ چھپنا ہی بہتر ہے" یہ جواب سن کر مجھے شاید ایک جھرجھری سی بھی آئی اور دل میں شاید کچھ کچھ ہنسی بھی۔ مجھے اس وقت اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ دور افتادہ جگہ میں اُگا ہوا یہ سادہ سا نوجوان ایک روز لاہور شہر کے دل پر حکومت کریگا اور اردو ادب کا ایک پورا دور اس کے نام اور کام سے روشنی پائے گا۔

لاہور کی ادبی زندگی میں ان دنوں ابو الاثر حفیظؔ جالندھری اور شاعرِ رومان حضرت اخترؔ شیرانی کا طوطی بول رہا تھا۔ حفیظؔ صاحب کوٹھیوں میں رہتے اور موٹروں میں گھومتے یوں بھی کچھ باقاعدہ سے، کچھ لیے دیئے سے، دور کے ڈھول بعض اوقات غلط بھی سنائی دیتے ہیں۔ ہم نے ازخود یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم حفیظؔ کے آدمی نہیں اخترؔ کے آدمی ہیں۔ شاعرِ رومان ایک تو ویسے ہی نوجوان نسل کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ پھر کالج کے آس پاس کے گلی کوچوں میں جھومتے جھامتے مل جاتے اور اللہ بخشے پہلی ملاقات ہی میں غیریت کا پردہ چاک کر کے الگ پھینک دیتے۔ ان سے ملاقات سہل بھی تھی اور خوشگوار بھی مجھ سے پہلے تابش صدیقی ان کے راسخ مریدوں میں شامل ہو چکا تھا۔ میں بھی تابش کے وسیلے سے ان کے حلقے میں پہنچا۔ وہ اپنے نامور والد علاّمہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے ساتھ فلیمنگ روڈ کی ایک دو تین منزلہ حویلی میں رہتے تھے جو ایک احاطے کے اندر واقع تھی پہلی منزل سے بھی پہلے، ایک تنگ نیم تاریک سی بغلی کوٹھڑی میں ان کی نشست رہتی۔ خواب گاہ بھی یہی تھی۔ ایک چارپائی پر بستر، سامنے میز پر رسالہ رومان کا دفتر اور حجامت کا سامان ملاقاتی بھی یہیں آکر ان سے اپنے اپنے حسن یار کی باتیں کرتے۔ ندیم سے ان کے ہاں کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی۔ اخترؔ کی محفل میں چونکہ بندہ و صاحب و محتاج و غنی۔ بالکل ایک ہو جاتے تھے۔ اس لیے ان کے بعض چھوٹے چھوٹے نیاز مند بھی ان کے سامنے گفتگو میں خاصی بے تکلفی کا انداز اختیار کر لیتے۔ ندیمؔ غالباً واحد نوجوان تھے جو اخترؔ کے حضور میں سرتاپا ادب کا مرقع بنے، خاموش

بیٹھے رہتے۔ اختر اگر خاص طور پر ان سے کوئی بات پوچھتے تو جواب میں کوئی جچی تلی بات کہ
دیتے۔ جو چمکیلی بھی ہوتی اور اطلس، کمخواب میں لپٹی ہوئی بھی، ورنہ گھنٹوں بیٹھے رہتے او
وہی —— جی جناب...... بہت اچھا...... بجا ارشاد فرمایا —— کی سرحد سے آگے
تجاوز نہ کرتے۔ اختر کے نیاز مندوں میں سب سے زیادہ سنجیدہ سب سے زیادہ مودّ
اور پارسا ندیم ہی تھا۔ یوں لگتا جیسے وہ اختر شیرانی کو دیکھنے، ان کی باتیں سننے، ان کی دیکھ
بھال کرنے کی غرض سے وہاں کسی "ادبی یاترا" پر آئے بیٹھے ہوں۔ ندیم کی اس ادا میں عباد
کی سی پاکیزگی، خلوص اور لگن کا اندازہ ملتا۔

اختر شیرانی بھی ان کو بہت عزیز رکھتے۔ محبت تو وہ بھی سے کرتے، لیکن ندیم کی عزت
بھی کیا کرتے۔ ندیم کبھی لاہور سے باہر ہوئے اور ان کا خط آگیا تو اختر ان کے خط کو، ایک
قلبی لطف کے لگاؤ کے ساتھ، اپنے احباب اور نیاز مندوں کو سنایا کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ
نوجوان پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کے اخلاص و اخلاق کا یہ پرتو اس کی شخصیت کے ایک بہت
ہی اہم رُخ کی ترجمانی کرتا ہے۔ میری رائے میں ندیم کی وسیع انسانی ہمدردی اس کے دل و
کی روشنی اور بصیرت، اس کی دردمندی اور دل نوازی نے جو اس کے عظیم فن کا امتیا
خاص ہیں، ندیم کی اعلیٰ سیرت ہی سے جنم لیا ہے یہ روشنی اس کی خود کشید ہے!

اس اثناء میں لاہور سے جب میرا آب و دانہ اٹھا تو کوئی دس بارہ برس کی مد
کے بعد دوسری جنگِ عظیم میں سے گزرتا ہوا راولپنڈی میں آکر بیٹھا۔ اب کبھی کبھار ندیم
روزنامہ "امروز" کے دفتر میں (پیر و مرشد) مولانا چراغ حسن حسرت کی بارگاہ میں ملاقات
جاتی۔ مولانا حسرت "امروز" سے رخصت ہوئے تو اخبار کی کرسی ادارت ندیم کو تفویض ہو
اس عرصے میں ندیم کی شہرت و عظمت کا آفتاب افق پر کئی نیزے بلند ہو چکا تھا۔ وہ ایک بلن
پایہ شاعر، منفرد افسانہ نگار، بالغ نظر نقاد، اور ایک باکمال صحافی اور انشاء پرداز کی حیثیت
سے مانے جا چکے تھے ان کی ریڈیائی نگارشات کی دھوم تھی۔ ان کے فکاہی کالم کی خوشبو دور

دور تک پھیل رہی تھی۔ کامیابی کے ساتھ دو ایک فلموں کے مکالمے لکھنے کا سہرا بھی ان کے سر بندھ چکا تھا۔ گویا عسکری زبان میں وہ بیک وقت چھ سات مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے مورچہ کھود کر بیٹھے ہوئے نہ تھے، آگے بڑھ کر لڑ رہے تھے۔ اس کا قلم ایک کے بعد ایک، خوابوں کا جزیرہ سر کرتا چلا جا رہا تھا ادب کا عام قاری حیران تھا کہ دیکھو جس راستے سے گزرتا ہے پھول اگاتا، چراغ جلاتا چلا جا رہا ہے جتنا سفر طے کرتا ہے اتنا ہی تازہ دم دکھائی دیتا ہے سوادِ اعظم کے دل میں ندیم کے لیے پیار اور تکریم کے جذبات، اس کی تخلیقات کو ملتا اور درد کے حوالے سے، ندی سے دریا اور دریا سے سمندر بن رہی تھیں۔ مگر "خواص" کے بعض حلقوں میں کچھ اندیشے بھی لرزتے نظر آتے کہ ادب کی عظمت کا اندازہ تعداد سے نہیں، معیار سے کیا جاتا ہے۔

ندیم نے ابھی تک جس رنگ سے جتنا لکھا تھا گو وہ اعلیٰ ادب ہی تھا۔ پھر اس کے فکر و نظر کی خوبیاں اور خوبصورتیاں، ندیم کے ادب کو باقی اعلیٰ ادب سے جدا اور ممتاز بھی کرتی تھیں۔ تاہم برس دو برس میں ایک آدھ غزل لکھنے والے شاعروں کو خدشہ تھا کہ مقدار کا اتنا بوجھ اٹھا کر چلنے سے اس کی کمر دوہری ہو جائے گی۔ اولاد اتنی زیادہ ہو تو وہ توانا و تندرست اور آسودہ خوشحال نہیں رہ سکتی۔ ایک قسم کی مٹی سے بیک وقت کئی مختلف اقسام کے پودے پھل پھول، درخت اور ترکاریاں اُگا کر، ان کی یکساں پرورش کرنا قریب قریب محال امر ہے

ان لوگوں میں اکثریت ان اصحاب کی تھی جو خود بھی تخلیقی ادب کی توفیق نہیں رکھتے تھے اور دوسرے پر کو نسبتاً آرام دہ اور زیادہ منفعت بخش دھندوں کی مصروفیات نے ان کے دل میں تخلیقی عمل کے قرب سے گزرنے کی لگن یا تڑپ بھی باقی نہیں رہنے دی تھی۔ البتہ تنقید کے لیے یہ انگریزی اور فرانسیسی کے چلتے ہوئے جملے خوب چُست کر لیتے تھے تو ان گنی گیانیوں کا قیاس تھا کہ دیکھ لینا آگے چل کر ندیم کی نثر، ندیم کی شاعری سے آگے نکل جائے گی۔ اس کا افسانہ کسی نقطے پہ آ کر جم جائے گا۔ نقد و نظر کی صلاحیت کسی موڑ پہ اچانک بھاگ جائے گی اور شاعری میں تو ایسی خانہ جنگی بپا ہو گی کہ نظم غزل کو اور غزل نظم کو مار کر ہی دم لے گی۔ ان کا خیال تھا کہ ادب کی مختلف

چھ سات اصناف اگر ایک ہی صف میں پہلو بہ پہلو "مارچ کرنے لگیں تو صف سیدھی نہیں رہ سکتی۔" کامن ویلتھ" کی طرح کے وسیع اور متنوع لشکروں کو پڑاؤ کے بغیر لے کر چلنا، کوئی آسان کام نہیں۔ اس عالم میں تو لکھنے والا بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ کوئی ٹکڑا یہاں گرے گا، کوئی وہاں، مزید برآں جب ندیم نے کوچۂ صحافت میں قدم رکھ کر، صحافت کے "ملک الموت" یعنی روزانہ فکاہی کالم سے بھی پنجہ کشی شروع کر دی تو معاملہ گویا بہت ہی سنگین ہو گیا۔ یہ ہر روز نیا کنواں کھود کر پانی پینے کے مصداق تھا۔ اچھے اچھے اس میدان میں اترے مگر دوسروں کو ہنساتے ہنساتے بیچاروں کی اپنی ہی گھگھی بندھ گئی۔

یہ اندیشے اپنی جگہ پر کچھ غلط نہ تھے، ندیم کے ظرف و ذہانت سے کمتر آدمی واقعی ادب میں ٹامک ٹوئیے مارنے لگتا۔ میں تو اسے ندیم کے حوصلے، استقامت کار، فن سے اس کے عشق اور اس کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا معجزہ کہوں گا۔ کہ اس نے جس صنف میں بھی قلم اٹھایا، نہ صرف یہ کہ اس کی روایت کو چار چاند لگا دیئے۔ بلکہ اس کے راستے میں فن و فکر کے نئے نئے چراغ بھی روشن کرتا چلا گیا حد یہ ہے کہ وہ صحافت کو بھی ادب کی سطح پہ لے آیا۔ جلال اور جمال اس کے فن کے دو توام جذبے یا مظاہر ہیں۔ مگر جمالیات میں اس کا وجدان و احساس اتنا لطیف اتنا متوازن اور دلفریب ہے کہ الفاظ ان کے قلم سے پھول بن کر برستے ہیں۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ندیم اس دَور کی عظیم ادبی شخصیتوں میں سے ہیں۔ گزشتہ آٹھ دس برسوں میں اس حقیقت کا اعتراف دلوں سے گزر کر زبانوں پر بھی آگیا ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جو شخص زندگی ہی میں "شخص" سے "شخصیت" بن جائے وہ اس انداز میں بات کرتا ہے جیسے وہ کسی اونچے مینار سے نیچے میدان میں کھڑے لوگوں سے مخاطب ہو مگر ندیم کا انکسار بڑھتا جا رہا ہے، مجھے ان سے اب بھی گاہے گاہے ادب کے "ہوائی اڈوں" یعنی مشاعروں میں ملاقات کا موقع مل جاتا ہے۔ اسی اکتوبر میں جب واہ چھاؤنی کی افسر کلب نے ان کے اعزاز میں ایک شام کی تقریب آراستہ کی تو ہم دونوں نے کرنل شیر محمد شاد کے گھر میں ایک پوری شب

ر رفتہ کو آوازیں دینے میں گزاری۔ مجھے تو آج کا ندیم بھی وہی ندیم معلوم ہوتا ہے جو تیس
رس پہلے مجھے دیواز ہوسٹل میں ملا تھا۔ بلکہ یہ شاخ اثمار شیریں سے جس قدر بھرتی جا رہی ہے۔ اتنی
ی جھکتی جا رہی ہے۔ پچھلے دنوں جب میں یہ سطور لکھ رہا تھا۔ صدرِ پاکستان نے عظیم منگلا ڈیم کا
فتتاح کیا تھا۔ ندیم کے تذکرے میں جب نگاہ اس کی تخلیقات کی رنگا رنگی کی طرف جاتی تو ذہن
"منگلا" کی طرف بھی منتقل ہو جاتا۔ اور مجھے ندیم کی ذات بھی ادب و تہذیب کا ایک عظیم "منگلا ڈیم"
علوم ہوتی۔ چند مماثلتیں دیکھیے۔

منگلا ڈیم اور ندیم

منگلا تعمیر کا کارنامہ ہے۔	ندیم تخلیق کا سرچشمہ ہے۔
منگلا ڈیم نے دریا کو تسخیر کیا۔	ندیم نے دلوں کو تسخیر کیا۔
منگلا زمینوں اور کھیتوں کو سیراب کریگا۔	ندیم دلوں اور خیالوں کو سیراب کر رہا ہے
منگلا سے چھ سات نہریں نکلیں گی۔	ندیم، کی چھ سات نہریں چل رہی ہیں۔
منگلا عظیم الشان منصوبہ ہے	ندیم عظیم الشان انسان ہے۔

میری دعا ہے کہ خداوندِ رحیم و کریم خشت و سنگ کے "منگلا ڈیم" اور ادب و تہذیب
ے "منگلا ڈیم" ——— ہمارے ان دونوں عظیم سرچشموں کو مدتوں سلامت رکھے کہ یہ دونوں ہمارے
زم اور ہماری آبرو کی علامت ہیں۔

اُردو ادب کا کوہ کن

حضرت احسان دانش ایک گراں مایہ تہذیبی متاع ہیں۔ اس دور کو انہوں نے اتنا کچھ دیا ہے کہ ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔ ان کے ایک دیرینہ نیاز مند کی حیثیت سے میں ایک مدت سے ان کے بارے میں اپنے تاثرات لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مگر بدقسمتی سے میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے سمندِ شوق پر جب تک کوئی مہمیز نہ لگے، وہ قدم آگے نہیں اٹھاتے۔ بارے کہ "جہانِ دانش" کی اشاعت پر اس آرزو کی تکمیل کی تقریب نکل آئی۔ اگرچہ یہ اسی نوع کی آرزو ہے کہ جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے ع

وہ کہتے ہیں کہ نکلی ہے میں کہتا ہوں نہیں نکلی

احسان صاحب اندر باہر سے مزدور ہیں۔ زمانے کی خُو کچھ بھی رہی۔ انہوں نے اپنی وضع نہیں بدلی جو کُرتا ٹوپی وہ کاندھلے سے پہن کر نکلے تھے، وہ نہ سہی، مگر ویسا ہی لباس آج تک پہنتے ہیں۔ کبھی تکلف کی بہت موج آگئی تو اوپر شیروانی یا واسکٹ "اوڑھ" لیتے ہیں۔ "اوڑھ" میں نے اس لیے کہا کہ وہ شعر جتنا چُست کہتے ہیں، لباس اتنا ہی ڈھیلا رکھتے ہیں۔

میں نے پہلی بار انہیں ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں دیکھا، جو نواں کوٹ میں انجمن کے یتیم خانے کے کشادہ دالان میں منعقد ہوا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ میں گورنمنٹ ہائی سکول جہلم کے اسکاؤٹ دستے کے ساتھ سامعین کو پانی پلانے کی خدمت پر مامور تھا اب یہ تو یاد نہیں کہ جلسے کا صدر کون تھا، یا تقریریں کن کن بزرگوں نے فرمائیں ہاں، دو شاعروں کا نقش اسی وقت سے ذہن میں مُرتسم چلا آتا ہے۔ ایک تھے ابوالاثر حفیظ جالندھری اور دوسرے احسان بن دانش کاندھلوی۔ حفیظ صاحب ابوالاثر بن چکے تھے۔

دور تک پھیل رہی تھی۔ کامیابی کے ساتھ دو ایک فلموں کے مکالمے لکھنے کا سہرا بھی ان کے سر بندھ چکا تھا۔ گویا عسکری زبان میں وہ بیک وقت چھ سات مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے مورچہ کھود کر پیچھے نہ تھے، آگے بڑھ کر لڑ رہے تھے۔ اس کا قلم ایک کے بعد ایک، خوابوں کا جزیرہ سر کرتا چلا جا رہا تھا ادب کا عام قاری حیران تھا کہ دیکھو جس راستے سے گزرتا ہے پھول اگاتا، چراغ جلاتا چلا جا رہا ہے جتنا سفر طے کرتا ہے اتنا ہی تازہ دم دکھائی دیتا ہے سوادِ اعظم کے دل میں ندیم کے لیے پیار اور تکریم کے جذبات، اس کی تخلیقات کو ملتا اور درد کے حوالے سے، ندی سے دریا اور دریا سے سمندر بن رہی تھیں۔ مگر "خواص" کے بعض حلقوں میں کچھ اندیشے بھی لرزتے نظر آتے کہ ادب کی عظمت کا اندازہ تعداد سے نہیں، معیار سے کیا جاتا ہے۔

ندیم نے ابھی تک جس رنگ سے جتنا لکھا تھا گو وہ اعلیٰ ادب ہی تھا۔ پھر اس کے فکر و نظر کی خوبیاں اور خوبصورتیاں، ندیم کے ادب کو باقی اعلیٰ ادب سے جدا اور ممتاز بھی کرتی تھیں۔ تاہم برس دو برس میں ایک آدھ غزل لکھنے والے شاعروں کو خدشہ تھا کہ مقدار کا اتنا بوجھ اٹھا کر چلنے سے اس کی کمر دوہری ہو جائے گی۔ اولاد اتنی زیادہ ہو تو وہ توانا و تندرست اور آسودہ خوشحال نہیں رہ سکتی۔ ایک قسم کی مٹی سے بیک وقت کئی مختلف اقسام کے پودے پھل پھول، درخت اور ترکاریاں اگا کر، ان کی یکساں پرورش کرنا قریب قریب محال امر ہے

ان لوگوں میں اکثریت ان اصحاب کی تھی جو خود بھی تخلیقی ادب کی توفیق نہیں رکھتے تھے اور دوسرے یہ کہ نسبتاً آرام دہ اور زیادہ منفعت بخش دھندوں کی مصروفیات نے ان کے دل میں تخلیقی عمل کے قرب سے گزرنے کی لگن یا تڑپ بھی باقی نہیں رہنے دی تھی۔ البتہ تنقید کے لیے ہی انگریزی اور فرانسیسی کے چلتے ہوئے جملے خوب چست کر لیتے تھے تو ان گنی گیانیوں کا قیاس تھا کہ دیکھ لینا آگے چل کر ندیم کی نثر، ندیم کی شاعری سے آگے نکل جائے گی۔ اس کا افسانہ کسی نقطے پہ آ کر جم جائے گا۔ نقد و نظر کی صلاحیت کسی موڑ پہ اچانک بھاگ جائے گی اور شاعری میں تو ایسی خانہ جنگی بپا ہو گی کہ نظم غزل کو اور غزل نظم کو مار کر ہی دم لے گی۔ ان کا خیال تھا کہ ادب کی مختلف

چھ سات اصناف اگر ایک ہی صف میں پہلو بہ پہلو "مارچ کرنے لگیں تو صف سیدھی نہیں رہ سکتی۔ "کامن ویلتھ" کی طرح کے وسیع اور متنوع لشکروں کو پڑاؤ کے بغیر لے کر چلنا، کوئی آسان کام نہیں۔ اس عالم میں تو لکھنے والا بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ کوئی ٹکڑا یہاں گرے گا، کوئی وہاں، مزید برآں جب ندیمؔ نے کوچۂ صحافت میں قدم رکھ کر، صحافت کے "ملک الموت" یعنی روزانہ فکاہی کالم سے بھی پنجہ کشی شروع کر دی تو معاملہ گویا بہت ہی سنگین ہو گیا۔ یہ ہر روز نیا کنواں کھود کر پانی پینے کے مصداق تھا۔ اچھے اچھے اس میدان میں اترے مگر دوسروں کو ہنساتے ہنساتے بیچاروں کی اپنی ہی گھگھی بندھ گئی۔

یہ اندیشے اپنی جگہ پر کچھ غلط نہ تھے، ندیم کے ظرف و ذہانت سے کمتر آدمی واقعی ادب میں ٹامک ٹوئیے مارنے لگتا۔ میں تو اسے ندیم کے حوصلے، استقامتِ کار، فن سے اس کے عشق اور اس کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا معجزہ کہوں گا۔ کہ اس نے جس صنف میں بھی قلم اٹھایا، نہ صرف یہ کہ اس کی روایت کو چار چاند لگا دیئے۔ بلکہ اس کے راستے میں فن و فکر کے نئے نئے چراغ بھی روشن کرتا چلا گیا حد یہ ہے کہ وہ صحافت کو بھی ادب کی سطح پر لے آیا۔ جلال اور جمال اس کے فن کے دو توام جذبے یا مظاہر ہیں۔ مگر جمالیات میں اس کا وجدان و احساس اتنا لطیف اتنا متوازن اور دلفریب ہے کہ الفاظ ان کے قلم سے پھول بن کر برستے ہیں۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ندیم اس دَور کی عظیم ادبی شخصیتوں میں سے ہیں۔ گزشتہ آٹھ دس برسوں میں اس حقیقت کا اعتراف دلوں سے گزر کر زبانوں پر بھی آگیا ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جو شخص زندگی ہی میں "شخص" سے "شخصیت" بن جائے وہ اس انداز میں بات کرتا ہے جیسے وہ کسی اونچے مینار سے نیچے میدان میں کھڑے لوگوں سے مخاطب ہو۔ مگر ندیم کا انکسار بڑھتا جا رہا ہے، مجھے ان سے اب بھی گاہے گاہے ادب کے "ہوائی اڈوں" یعنی مشاعروں میں ملاقات کا موقع مل جاتا ہے۔ اسی اکتوبر میں جب واہ چھاؤنی کی افسر کلب نے ان کے اعزاز میں ایک شام کی تقریب آراستہ کی تو ہم دونوں نے کرنل شیر محمد شادؔ کے گھر میں ایک پوری شب

عمرِ رفتہ کو آوازیں دینے میں گزاری۔ مجھے تو آج کا ندیم بھی وہی ندیم معلوم ہوتا ہے جو تیس برس پہلے مجھے دیوا ز ہوسٹل میں ملا تھا۔ بلکہ یہ شاخ اثمارِ شیریں سے جس قدر بھرتی جارہی ہے۔ اتنی ہی جھکتی جارہی ہے۔ پچھلے دنوں جب میں یہ سطور لکھ رہا تھا۔ صدرِ پاکستان نے عظیم منگلا ڈیم کا افتتاح کیا تھا۔ ندیم کے تذکرے میں جب نگاہ اس کی تخلیقات کی رنگا رنگی کی طرف جاتی تو ذہن "منگلا" کی طرف بھی منتقل ہو جاتا۔ اور مجھے ندیم کی ذات بھی ادب و تہذیب کا ایک عظیم "منگلا ڈیم" معلوم ہوتی۔ چند مماثلتیں دیکھیے۔

منگلا ڈیم اور ندیم

منگلا تعمیر کا کارنامہ ہے۔	ندیم تخلیق کا سرچشمہ ہے۔
منگلا ڈیم نے دریا کو تسخیر کیا۔	ندیم نے دلوں کو تسخیر کیا۔
منگلا زمینوں اور کھیتوں کو سیراب کریگا۔	ندیم دلوں اور خیالوں کو سیراب کر رہا ہے
منگلا سے چھ سات نہریں نکلیں گی۔	ندیم، کی چھ سات نہریں چل رہی ہیں۔
منگلا عظیم الشان منصوبہ ہے	ندیم عظیم الشان انسان ہے۔

میری دعا ہے کہ خداوندِ رحیم و کریم خشت و سنگ کے "منگلا ڈیم" اور ادب و تہذیب کے "منگلا ڈیم" ـــــ ہمارے ان دونوں عظیم سرچشموں کو مدتوں سلامت رکھے کہ یہ دونوں ہمارے عزم اور ہماری آبرو کی علامت ہیں۔

اُردو ادب کا کوہ کن

حضرت احسان دانش ایک گراں مایہ تہذیبی متاع ہیں۔ اس دُور کو انہوں نے اتنا کچھ دیا ہے کہ ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔ ان کے ایک دیرینہ نیاز مند کی حیثیت سے میں ایک مدت سے ان کے بارے میں اپنے تاثرات لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مگر بدقسمتی سے میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے سمندِ شوق پر جب تک کوئی مہمیز نہ لگے، وہ قدم آگے نہیں اٹھاتے۔ بارے کہ "جہانِ دانش" کی اشاعت پر اس آرزو کی تکمیل کی تقریب نکل آئی۔ اگرچہ یہ اسی نوع کی آرزو ہے کہ جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے ع

وہ کہتے ہیں کہ نکلی ہے میں کہتا ہوں نہیں نکلی

احسانؔ صاحب اندر باہر سے مزدور ہیں۔ زمانے کی خُو کچھ بھی رہی۔ انہوں نے اپنی وضع نہیں بدلی جو کُرتا ٹوپی وہ کاندھلے سے پہن کر نکلے تھے، وہ نہ سہی، مگر ویسا ہی لباس آج تک پہنتے ہیں۔ کبھی تکلف کی بہت موج آگئی تو اوپر شیروانی یا واسکٹ "اوڑھ" لیتے ہیں۔ "اوڑھ" میں نے اس لیے کہا کہ وہ شعر جتنا چُست کہتے ہیں، لباس اتنا ہی ڈھیلا رکھتے ہیں۔

میں نے پہلی بار انہیں ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں دیکھا، جو نواں کوٹ میں انجمن کے یتیم خانے کے کشادہ دالان میں منعقد ہوا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ میں گورنمنٹ ہائی سکول جہلم کے اسکاؤٹ دستے کے ساتھ سامعین کو پانی پلانے کی خدمت پر مامور تھا اب یہ تو یاد نہیں کہ جلسے کا صدر کون تھا، یا تقریریں کن کن بزرگوں نے فرمائیں ہاں، دو شاعروں کا نقش اسی وقت سے ذہن میں مُرتسم چلا آتا ہے۔ ایک تھے ابوالاثر حفیظ جالندھری اور دوسرے احسانؔ بن دانش کاندھلوی۔ حفیظ صاحب ابوالاثر بن چکے تھے۔

یُوں بھی بچوں کے "پھول" اخبار میں ان کی "ٹرّم دم ٹرّم قسم" کی نظموں کی وجہ سے ہم لوگ ان کے نام سے آشنا تھے، مگر احسان کا نام بالکل نیا تھا۔ ناظم جلسہ نے جب ان کو نظم پڑھنے کی دعوت دی، تو ہم نے یہی سوچا کہ اگلی قطاروں میں بیٹھے ہوئے دوہرے تہرے جسموں والے معتبرین میں سے کوئی بزرگ کھانستے کھنکارتے اٹھیں گے، لیکن وہ تو ایک بالکل ہی نوجوان، بلکہ لڑکا سا شاعر اٹھا۔ گہرا سانولا رنگ سر پہ ٹوپی تن پہ شاید شیروانی بھی دونوں کا رنگ بھی شاید سیاہ ہی تھا۔ کہ ان کی پہلی جھلک کا جو تصور میرے ذہن میں قائم ہے اس میں سنولاہٹ کے سائے بہت گہرے ہیں تو ہم لوگ ان کو دیکھ کر خاصے حیران ہوئے بات تھی ہی ایسی۔ وہ اگر ہمارے اسکول میں ہوتے، تو بس یہی ایک دو جماعتیں ہم سے آگے ہوتے۔ ممکن ہے پیچھے ہی ہوتے کہ ہمارے مدرسے میں ان سے بھی بڑے بڑے لڑکے پچھلی جماعتوں میں اٹکے پڑے تھے۔ اُن کو دیکھ کر یہ احساس بھی ہوا کہ اگر وہ ہمارے اسکول میں ہوتے تو ان حاضر باش طلبہ میں سے ہوتے جو چھ چھ سات سات کوس سے پیدل چل کر آتے۔ مگر کیا مجال جو ایک ناغہ بھی ہو جائے۔ جیسا کچھ بھی کھاتے تھے گھر پر ہی کھاتے۔ ان کی فیس عموماً معاف ہوتی۔ فیس لگ جاتی تو مدرسہ چھوٹ جاتا۔ مرغی کے لیے تنکے کا زخم بھی بہت ہوتا ہے ع

نگاہ سے بھی بدن پر نشان پڑتا ہے

جب یہ لڑکا شاعر نظم پڑھنے کے لیے اٹھا تو ہمیں یہی توقع تھی کہ اوّل تو ہماری جماعت کے ملک الشعراء جمشید عالم عیش کی طرح لڑکھڑا کر چاروں شانے چت گر پڑے گا یا نظم پڑھتے وقت ہونٹوں سے زیادہ ٹانگیں کانپتی رہیں گی۔ مگر صاحب اس نوخیز شاعر نے تو پہلے دو شعروں ہی میں سماں باندھ دیا۔ نظم میں یتیم بچے کی محرومیوں کی ترجمانی کی گئی تھی۔ شعر بھی اچھے ہوں گے لیکن اتنا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ سامعین کی آنکھیں تر ہوتی جا رہی تھیں۔ نظم وہ ترنم کے ساتھ سنا رہے تھے جس میں بلا کا جادو تھا۔ لوگ آواز کی لہروں کے ساتھ ساتھ جھوم رہے تھے ہمارا اسکاؤٹ دستہ بھی مٹی کے آبخوروں کو مٹکوں پہ ٹکا کر ان کی طرف متوجہ

ہوگیا۔ ہمہ تن گوش۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک جب مجھے اپنی تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہنا پڑا۔ تو ان کو دیکھنے اور سننے کے مواقع بھی ملتے رہے، مگر یہ دُور ہی کا جلوہ تھا۔ آپ ان دنوں غالباً کسی کتابوں کی دوکان پر کام کرتے تھے۔ یوں مشاعروں کی کامیابی کے لیے اُن کا نام "باکس آفس ہٹ" کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وہ مشاعرے کے ان چند "اسٹار شعرار" میں سے تھے جن کا صرف "گلا" ہی نہیں بولتا تھا "کاغذ" بھی بولتا تھا۔ اب ایک مدت سے وہ تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں مگر "کشتوں کے پشتے" لگا دینے کی کاٹ اب بھی وہی ہے۔ ان کا شعر کسی بیساکھی کا محتاج نہیں۔

احسان صاحب کی شاعری پر تکان کا سایہ آج تک نہیں آیا، وہ خود جتنے بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں، اُن کا شعر اتنا ہی جوان ہوتا جا رہا ہے، مگر جس دور کا ذکر ابھی میں کر رہا ہوں، وہ ان کے عنفوانِ شباب کا دور تھا۔ اُردو شاعری میں اُن کی آواز بنیادی طور پر کوئی بالکل نئی یا اجنبی آواز تو نہ تھی۔ کہ وہ روایت کی پُوری میراث کو سر پہ اٹھائے ادب کی "جرنیلی سڑک" پر ہی چل رہے تھے، مگر ان کے اسلوب میں تخلیقی تازگی اور توانائی کا جوہر بہت نمایاں تھا۔ مناظرِ فطرت کے حُسن کو الفاظ میں "جھلکارنے" کے ہُنر پر ان کو خاص دسترس حاصل تھی۔ اُن کی شاعری تصویروں کی شاعری تھی۔ تشبیہات اُن کے شعروں پر اسی طرح اُترتی تھیں جیسے بہار کے موسم میں شاخیں شگوفوں سے بھر جاتی ہیں۔ طبقاتی ناہمواریوں، ناآسودگیوں اور ناانصافیوں کی عکاسی میں وہ انجمن میں تنہا تو نہ تھے۔ مگر اس درد کی کسک ان کے اپنے لہُو سے کشید ہو کر نکلتی تھی۔ اس لیے وہ بجا طور پر، شاعرِ مزدور کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

اس وقت کا لاہور ادب و تہذیب کے عظیم میناروں کا شہر تھا۔ علامہ اقبال تو خیر کوہِ ہمالیہ تھے، مولانا ظفر علی خاں بھی سیاست و صحافت و خطابت کی نسبتوں سے چیزے دیگر تھے۔ ادبی مجلسوں کی صدارت پر عموماً جسٹس سر عبدالقادر اور راجہ نریندر ناتھ جیسے اہلِ علم

داہلِ نظر بزرگ فائز ہوتے تھے جو اپنے لطیف اور بلیغ تعارفی، تعریفی، توجیہی جملوں سے محفل
ل لطافت و معنویت کو چار چاند لگا دیتے تھے، جہاں تک عام ادبی ماحول کا تعلق تھا حفیظ
یا لندھری، پروفیسر پطرس بخاری شاعرِ رومان اختر شیرانی، ڈاکٹر تاثیر، مولانا تاجور نجیب آبادی
مولانا صلاح الدین احمد، مولانا حامد علی خاں، سید عابد علی عابد، صوفی تبسم اور اسی طرح
کے بلند و بالا کئی دوسرے ادبا و شعرا لاہور کے ادبی حواس پہ چھائے ہوئے تھے حلقۂ
ارباب ذوق کی باقاعدہ نیو تو ابھی تک نہیں اٹھائی گئی تھی لیکن نوجوان قلم کاروں کا ایک
یا لا حلقہ میراجی کے گرد جمع ہو گیا تھا اور ترقی پسند تحریک کا چرچا تو سارے ہندوستان
یں چل نکلا تھا۔ نوجوانوں میں سے فیض، راشد، حفیظ ہوشیار پوری، ندیم اور یوسف ظفر
کے "شاعرانہ لب و رخسار" کا رنگ افق پر چھلک اٹھا تھا۔ اور اس مدینۂ علم و فضل میں
حسان دانش ایسا ایک خالص محنت کش، مکتبی تعلیم سے قطعاً کورا شخص ادب کے بلند ترین
دریچوں پر دستک دے رہا تھا۔ مشاعروں میں ان کی خاص دھاک تھی۔ مزدوروں کے
شب و روزِ حیات سے متعلق ان کی چند نظمیں مشاعروں میں اس قدر مقبول تھیں کہ لوگ ان
سے کوئی دوسرے نظم سنتے ہی نہ تھے۔

ادبی حلقوں میں گو ان کی مقبولیت بڑھ رہی تھی، مگر ان کے بارے میں اس نوع کی
چہ میگوئیاں بھی گشت کرتی رہتی تھیں...... کاندھلے کی مادری بولی میں کوئی بہت زور
بھی مارے گا، تو کتنی کچھ بڑی شاعری کرلے گا؟ علم کے بغیر دانش کا دریچہ آخر کیونکر کھلے گا؟
زندگی بہترین کتاب اور زمانہ بہترین استاد سہی، اگر گنجی نہلائے گی کیا نچوڑے گی کیا؟ لیکن لوگ
بھول رہے تھے کہ اصل چیز تحصیل علم کی لگن اور مضبوط قوت ارادی ہے نہ کہ مکتب کی چار دیواری
اُردو ادب میں آج احسان دانش کو جو مقام حاصل ہے، وہ اس لگن کا ثمرہ ہے۔ احسان صاحب
کو جب ہم نے دیکھا، تو ان کے ہاتھ میں کدال کے بجائے قلم تھا، لیکن ان سے مل کر ایک
بات ہمیشہ محسوس ہوئی کہ وہ جب چاہیں قلم چھوڑ کر کدال پکڑ سکتے ہیں، سیلاب جن راستوں

سے گزرتا ہے ان پر اپنی سیلن چھوڑ جاتا ہے۔ ان کی زندگی کا سادہ مبےتکلف، درویشانہ چلن سخت سے سخت مشقت اور لگاتار محنت کرنے کی صلاحیت، صعوبات اسی گزرے ہوئے سیلاب کے نشانات ہیں۔ جن سے ان کی گزرگاہِ حیات زرخیز ہوگئی ہے۔ ہم نے ان کے افلاس، ان کی جدّوجہد کی باتیں سنی تھیں، مگر سچی بات یہ ہے اس پس منظر کا صحیح اندازہ "جہانِ دانش" کے مطالعہ ہی سے ہوا۔ میری طرح بے شمار دوسرے لوگوں کو بھی شاید اسی سرگذشت سے معلوم ہوگا۔ کہ وہ باقاعدہ اینٹ گارا ڈھونے والے مزدور تھے، مٹی کھودنے چمڑا گانٹھنے کا کام انہوں نے کیا۔ مالی، چوکیدار اور چپڑاسی رہے۔ لاہور کے بازاروں میں سُرمہ، منجن بیچنے والوں کی طرح مجمع لگا کر اپنے اشعار فروخت کیے اور حد یہ ہے کہ رہٹ میں بیل کی طرح جت کر پانی بھی کھینچنا پڑا۔

"جہانِ دانش" ان کی خود نوشت روددادِ حیات کی پہلی قسط ہے جو ۶۴۷ صفحات پہ پھیلی ہوئی ہے۔ کائنات کی عظیم ترین اور دلچسپ ترین حقیقت خود انسان ہے ہر شخص کا سینہ تجربوں کا دفینہ ہے۔

خاشاک نے بھی دُودھ پیا ہے زمین کا

لیکن ہمارے ادب میں خود نوشت تذکروں کا ذخیرہ نسبتاً بہت کم ہے پھر ایک صنف کی حیثیت سے اس پر بیشتر ایسے لوگوں کا تسلط ہے جن کی زندگی تو ہر چند بھرپور نہ تھی البتہ تجوریاں بھری ہوتی تھیں اپنے حالات عموماً انہیں لوگوں نے لکھے ہیں جن کی ڈیوڑھی پر ہاتھی جھومتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نوع کے اکثر تذکرے انسانوں سے زیادہ ہاتھیوں کے تذکرے معلوم ہوتے ہیں، یا پھر شجرۂ نسب کے ایسے زینے کہ ان پر چڑھتے ہوئے آپ نامور جرنیلوں اور عالم پناہ تاج داروں سے ملاقات کرتے ہوئے حضرتِ آدم تک جا پہنچتے ہیں مگر ضمیرِ آدم تک نہیں پہنچ سکتے۔ خود نوشت کا رواج کچھ اس لیے بھی نہ چل سکا کہ اس میں بسا اوقات کچھ "پردہ نشینوں" کے نام اور چند ایک ایسے "سخت مقامات" آجاتے ہیں جن سے لوگ

دبے پاؤں گزر جانا پسند کرتے ہیں۔ "جہانِ دانش" ایک عام آدمی کی روداد حیات ہے عام بھی اتنا کہ بالکل ہی پچھلی صف کا آدمی مگر پھر بھی یہ روداد ایک ایسے عالی ہمت شخص کی روداد ہے جس نے زندگی کا تمام راستہ خود اپنے ہاتھوں سے چٹانیں کاٹ کاٹ کر بنایا ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجموعی طور پر ابھی تک اس صنف پر "جاگیرداروں" کی "مونا پلی" قائم تھی۔ "جہانِ دانش" کی اشاعت سے اس "مونا پلی" پر اگر پہلی نہیں تو پہلی بھرپور ضرب یقیناً لگی ہے۔

احسان صاحب نے نثر بھی بہت لکھی ہے، لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی شخصیت اتنی راسخ اور تناور ہو چکی ہے کہ ان کی نثر کی طرف نظر نہیں جاتی، مگر اپنی نظم کی طرح اپنی نثر میں بھی وہ کھری اور خوبصورت تشبیہات کے چراغ اس کثرت سے روشن کرتے چلے جاتے ہیں کہ بعض جھرمٹوں پر تو "میلۂ چراغاں" کا سماں بندھ جاتا ہے۔ ان کے ذخیرۂ الفاظ کی ندرت اور وسعت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اردو کا یہ مزدور شاعر الفاظ کا بہت بڑا ساہوکار ہے۔ محنت کش طبقوں کے معمولات و محسوسات کی ترجمانی کے لیے آپ نے بے شمار تہ نشین پسماندہ، خوابیدہ اور "پنشن یافتہ" لفظوں کو جس محرمانہ انداز میں، دوبارہ "حاضر نوکری" پر کمربستہ کر دیا ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے جس طرح ملتان کے چار تحفے گرد، گرما، گدا و گورستان ہیں "جہانِ دانش" کے چار تحفے، دانش، حوصلہ، صداقت اور اردو ہیں۔ اس کے پڑھنے سے آپ کھیت بھی اردو میں جوت سکتے ہیں اور بھاڑ بھی اردو میں چلا سکتے ہیں۔ مجھ کو اس کے مطالعہ سے ایسا لگا کہ اردو میری بیٹھک سے اٹھ کر میرے باورچی خانے میں آگئی ہے ممکن ہے بعض نقاد کہیں کہ صاحب فلاں لفظ کا نڈھلے کا لفظ ہے، لکھنؤ کا نہیں دہلی والوں نے فلاں لفظ کا مرزا داغ کے وقت سے حقہ پانی بند کر رکھا ہے ادب کی ایسی نک چڑھی بحثیں اپنی جگہ پر سہی، ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ "جہانِ دانش" سے "جہانِ اردو" کو وسعت ملی ہے بجز وسعت نہیں، زیبائی و رعنائی کا وہ تخلیقی پیرہن بھی ملا ہے، جس کے لمس سے کھردری چیز تون

کی یہ حکایت شبنم اور ریشم کے لہجے میں بیان ہو گئی ہے۔

احسان صاحب کی زندگی آبِ رکنا باد کی گلگشت نہیں، کھردری چٹانوں کا دشوار گزار سلسلہ ہے، لیکن اس بیابان میں رومان کا ایک لمبا چوڑا، سچ مچ کا نخلستان بھی پایا جاتا ہے۔ یہ شمی طوائف سے ان کے ربط و ضبط کی داستان ہے۔ مجھے معلوم نہیں احسان صاحب اپنی روزمرہ کی نجی زندگی میں سچ بولنے کی کتنی عادت اور قدرت رکھتے ہیں، مگر سرگذشت کی دھڑکنوں میں صداقت کا شعلہ برابر فروزاں نظر آتا ہے جو اس کتاب کی سب سے نمایاں خوبی ہے شمی کا واقعہ بھی انہوں نے کسی لگی لپٹی کے بغیر کھول کر قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے شمی ایک طوائف تھی، مگر ان کے کھینچے ہوئے اس کے باطنی سراپے کے مطابق —— "اس میں طوائفیت نہیں آئی تھی۔ شب و روز اخلاقی کچوکوں میں رہنے کے باوجود شرافت سے دستبردار نہیں ہوئی تھی"

وہ نہایت شستہ ادبی ذوق رکھتی تھی۔ بے شمار منتخب اشعار اس کو ازبر تھے احسان صاحب کے نام اس کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نثر بھی نہایت عمدہ لکھ لیتی تھی۔ وہ ایک امیر عورت بھی تھی۔

شمی ان سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ وہ بے چاری تو اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کرنے پر تلی ہوئی تھی، بلکہ ایک موقع پر جب آپ کاندھلے سے لاہور اٹھ آئے تھے، تو ان کی سفارش پر شمی ان کے ایک لاہوری دوست محمد شفیع سے عقد کرنے پر بھی آمادہ ہو گئی تھی۔ تاکہ کسی طور احسان صاحب کا قرب تو حاصل رہے۔ احسان صاحب بھی ہر چند دل میں اس کے لیے نہایت "نرم گوشہ" رکھتے تھے، مگر تعلقِ خاطر کے اس احساس کو انہوں نے اُنس و ہمدردی کے جذبے سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ وہ تو خیر آٹھوں پہر ان کی راہ تکتی رہتی تھی۔ یہ بھی اس کے ہاں جاتے، تو آرام کرسی پر بیٹھتے، چائے پیتے، کتابیں پڑھتے، مگر جوانی اور امنگوں کی بھرپور برساتوں کے درمیان معاملات کبھی "شرارت" کے مرحلے تک نہ پہنچے۔ وہ بارہا (جیسا کہ انہوں

نے لکھا ہے) سر جھکائے پھولوں سے لدی ہوئی چنبیلی کی طرح "—— ان کے —— "بازوؤں کے نیم دائرے میں" بھی آتی رہی، مگر ان کا ہاتھ کبھی بے ٹھکانا " نہ پڑا۔ ان کے اس رویّے پر یک گونہ حیرت بھی ہوتی ہے کہ اس طرح کا مرنجاں مرنج عشق کرنا گوشت پوست کے ایک عام جوان آدمی کے قابو کی چیز نہیں بالخصوص جبکہ ؎

وہ کہے پی آج تو تھوڑی سی پی میرے لیے

مگر پھر اسی رویّے سے دل میں ان کی وقعت اور عظمت کا اضافہ بھی ہوتا ہے۔ ان کے مضبوط قوّتِ اِرادی، ان کے محکم ضابطۂ اخلاق اور ان کی غیر متزلزل انفرادیت کا قائل ہونا پڑے گا کہ دیکھیے کیسی کڑی آزمائش سے کتنی استقامت و سلامتی کے ساتھ گزر گئے۔ منجدھار میں کھڑے رہے اور دامن کو تر نہ ہونے دیا۔ رہی حیرت کی بات تو اس کے ازالے کے لیے انہی کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

اس کی جانب سے تو ہے دعوتِ دیدار مجھے
کر نہ دیں میری نگاہیں کہیں انکار مجھے

ایک اور شعر میں تو مجھ جیسے "متحیراں" کو گویا براہِ راست ٹھوکا دے کر ارشاد فرمایا ہے ؎

جس کا مدت سے ہے شیشے کے مکانوں میں رواج
ہم پہ اس عشق کی تہمت نہ لگائی جائے

زندگی کے واقعات سے ظاہر ہے کہ تاریخی تسلسل ہی سے لکھے گئے ہیں، مگر احسان صاحب سن و سال کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتے، سو یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ آپ پہلی بار کاندھلہ سے لاہور کون سی ریل گاڑی میں آئے تھے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس سال میں وارد ہوئے؟ بہر حال "جہانِ دانش" ان کے لگ بھگ نصف صدی کے تجربات و مشاہدات کا مرقع ہے جس میں ایک اہم ادبی ماحول اور معاشرے کے عوامی دھارے کی چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی بھرپور ادبی زندگی کے باعث کتاب کا ایک سیکشن بجا طور پر، آل انڈیا مشاعروں

کے لیے وقف ہو گیا ہے قاری ان کی انگلی پکڑے پکڑے پورے ہندوستان میں گھوم کر مشاہیر اکابر شعرا سے ملاقات کر لیتا ہے، مگر چونکہ ایک مشاعرہ دوسرے مشاعرے سے چنداں مختلف نہیں ہوتا، بلکہ شعرا کا لباس اور طرزِ نشست و برخاست بھی تقریباً یکساں ہوتی ہے: لہٰذا قدرتی طور پر اس سکیشن میں قدرے یکسانیت کا احساس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا مشاعرہ اس طرح جم جائے کہ اکھڑنے میں نہ آئے۔

احسان صاحب کا دَور نہایت اہم سیاسی تحریکات کا دَور تھا۔ توقع تھی۔ کہ وہ اس رُخ پر بھی بھرپور نگاہ ڈالیں گے، مگر ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذہنی سفر کو ادب کی شاہراہ تک ہی محدود رکھا ہے یا ممکن ہے کہ ان مباحث کو کتاب کے دُوسرے حصے کے لیے اُٹھا رکھا ہو بہرحال اس بات میں شبہ نہیں کہ کیا ولولۂ حیات اور کیا محاسن ادب "جہانِ دانش" اس دور کی اہم اور یادگار تصنیفات میں شمار ہو گی۔ ان کی زندگی ایک شدید اور مسلسل جدّوجہد کی رُوداد ہے۔ سٹالن گراڈ کی لڑائی کی طرح ان کو ایک ایک قدم پر جنگ لڑنی پڑی ہے۔ افلاس کے خلاف، جہالت کے خلاف، ظلم اور ناانصافی کے خلاف۔ یہ کانٹوں پر تڑپ کر پھول تخلیق کرنے کی داستان ہے۔ بیشک تاریخ میں اس سے زیادہ کٹھن اور نتائج کے اعتبار سے کہیں زیادہ بارآور جدوجہد کی مثالیں موجود ہیں۔ دانش و حکمت اور خود شعر و ادب کے لحاظ سے بھی کتنے ہی بلند تر اور روشن تر مینار موجود ہیں، مگر ایسے لوگوں کی تعداد شاید ایسی زیادہ نہ ہو جنھوں نے ان کے جیسے حالات میں قلم و قرطاس کی ہمدمی کو اپنا نصب العین بنایا ہو اور اس میں درجۂ کمال حاصل کیا ہو ان کی طرح کے مزدوروں کو ہم نے لکھ پتی ٹھیکیدار بنتے دیکھا ہے، لیکن احسان دانش نے عمر بھر شعر و ادب کا کوہ کن رہنا پسند کیا۔ اس کی ساری عمر سخت پتھر توڑنے میں گزر گئی۔ مگر اس نے اپنے ضمیر کو، اپنے فقر کو کسی قیمت پر نہیں بیچا اور اور ہم اس کی تحصیلِ علم کی اسی امٹ لگن اور فقرِ غیور کی اسی قلندرانہ ادا پر فریفتہ ہیں انہی کا ایک شعر ہے

؎ جانے کیوں اُس ایک ہی صُورت پہ جا کے ہے نظر … شہر میں ہیں گندمی مٹّی کے پیکر اور بھی

آوازِ دوست کی چند لہریں

علمی و ادبی حلقوں میں "آوازِ دوست" کے مصنف کا آوازہ چند برس پیشتر "مینارِ پاکستان"
کے مضمون کی اشاعت پر بلند ہوا تھا۔ اس سے پہلے ان کی تقریروں کا شہرہ تھا مگر یہ چرچا مخصوص
ادبی و تہذیبی محفلوں تک ہی محدود تھا۔ "مینارِ پاکستان" پر ان کا مضمون شائع ہوا تو سچی
بات یہ ہے کہ "عنوان" دیکھ کر ماتھا کچھ تھوڑا سا ٹھنکا بھی تھا کہ کہیں تعمیراتی کمیٹی کے سربراہ
کی رپورٹ ہی نہ ہو اور سرکاری رپورٹوں میں عموماً مواد کم اور ملبہ زیادہ ہوتا ہے۔ ملازمت
میں یوں بھی، اکثر کلایو کے ہاتھوں "کارلائل" کا گلا گھٹ کر رہتا ہے۔

مختار مسعود کے بارے میں یہ گمان تو نہ تھا۔ کہ وہ چندے میں کمیٹی ہوئی عام کینڈے
کی کوئی ایسی جامد رپورٹ لکھیں گے جس کے پڑھنے سے ٹھیکیداروں کا بھلا ہوگا لیکن تکنیکی اور
بالخصوص تاریخی پہلو سے اس موضوع میں کچھ ایسے "مقاماتِ آہ و فغاں" بھی آتے تھے
کہ جب تک ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں عَلم نہ ہو، آدمی ان مقامات سے گزر نہ
سکتا تھا، یہ مینار خشت و سنگ کا کوئی عام انبار نہ تھا۔ یہ تو جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے
"ہماری نظریاتی تاریخ کی ضرورت، تحریکِ آزادی کی علامت، دین کی سرفرازی کا
راہ اور ہماری تاریخ کا نشانِ خیر ہے" —— اس کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے یہ احتیاط
بےحد ضروری تھی کہ "مینارِ پاکستان" لکھتے لکھتے کہیں "گلبرگ" نہ لکھ دیا جائے۔ ارادت اور
عمارت کی داستانیں اپنی جگہ پہ اہم تو بےشک ہوتی ہیں مگر اکثر کچھ ایسی دلچسپ نہیں ہوتیں۔
مینار بنانا مشکل ہی سہی "مینار پڑھوانا" بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن ان کا مضمون ہمارے
ادب میں بھی مینارۂ نور ثابت ہوا۔

محض ایک کتاب لکھنے پر تو کئی اہلِ قلم کو وسیع شہرت و قبولیت ملی ہے مثلاً ابھی چند برس پیشتر کرنل محمد خاں نے جنہیں اردو ادب کا جنرل رومیل کہنا غلط نہ ہوگا۔ "بجنگ آمد" لکھ کر دنیائے ادب کو اچانک ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ لیکن صرف ایک مضمون لکھنے پر اس طرح کا امتیاز میری محدود معلومات کے مطابق ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے بعد شاید مختار مسعود ہی کے حصے میں آیا ہے۔ شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" نے بھی دُور دُور تک ارتعاش پیدا کیا تھا۔ لیکن اس مضمون کی نوعیت قطعاً مختلف تھی۔

"آوازِ دوست" کو ہم نے شوق سے بھی پڑھا اور شبہ سے بھی، ہم نے ابھی تک ان کی چند تقریریں ہی سُنی تھیں، وہ بھی شدہ شدہ، لمبے لمبے وقفوں کے بعد۔ ان کی تقریر کا سبھاؤ ادر تھا۔ ہر موضوع پر اعلیٰ "پے ڈگری" (PIDIGREE) کے چاق و چوبند، نک سک سے درست، ہم وزن، ہمنوا اور ہم زلف الفاظ ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے حاضر رہتے تھے خطابت کا طنطنہ معنویت کے بطن سے ابھرتا تھا۔ گونج، گُن پر سوار آتی تھی۔ یہ نہیں کہ برانچ ریلوے لائن کے انجنوں کی طرح بھاپ زیادہ اگلیں اور فاصلہ کم طے کریں۔ انکی تقریریں سن کر بعض اوقات حیرت ہوتی کہ جب وہ ایک ایک لفظ کو پہلے روئی کے پُولے کی طرح نرم کرتے ہیں اور پھر گویا باقاعدہ کسی فیتے سے ناپ ناپ کر بولتے ہیں تو شعر کیوں نہیں کہتے آج کل تو بعض باقاعدہ شاعروں نے بھی شعر کے فنی مطالبات کی طرف جارحانہ بے پروائی کا کم دیش وہی رویّہ اختیار کر رکھا ہے جس کی جھلک پنجابی زبان کے کسی شاعر کے اس مصرعہ میں ملتی ہے ؏

میم : مرجانا جگ چھوڑ دینا، دنیا ٹنگ جانی اُتے کیکراں دے

مختار مسعود نے ایک جگہ لکھا ہے ــــــ "بڑے آدمی جتنے کتابوں میں ملتے ہیں اتنے زندگی میں نہیں ملتے"ــــــ یہی بات ذرا تصرف کے ساتھ خطیبوں کے بارے میں اس طرح کہی جا سکتی ہے کہ "بڑے خطیب جتنے زندگی میں ملتے ہیں اتنے کتابوں میں نہیں ملتے" تقریر کا

چڑھاؤ عموماً تحریر میں اتر جاتا ہے۔ فکر و فن کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کتاب ہی سے ہوتا ہے کتاب وہ ظالم چیز ہے کہ مصنف کے بارے میں اس طرح کی بے لاگ گواہی دے ڈالتی ہے جس طرح میدانِ حشر میں انسانوں کے اعضا، انسانوں کے بارے میں دیں گے۔ مختار مسعود کے متعلق سرگوشیوں میں ہی سہی مگر یہ بات بھی سننے میں آتی تھی کہ جناب سارا سالہ تو وہ مینار میں بھر چکے ہیں اب لکھیں تو کیا لکھیں؟

مگر کتاب دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کے فکر و فن کی زرخیزی اور دلآویزی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے بلکہ اب تو وہ مینار پر بھی بیٹھے ہیں اور دوربین بھی لگا رکھی ہے۔ کسی موضوع پر لکھنے کے دو ہی معروف طریقے ہیں۔ ایک تو باقاعدہ منصوبہ بندی والا، وہ سائنٹیفک طریقہ ہے جو شہرۂ آفاق مفکر اور مورخ پروفیسر ٹائن بی نے تجویز کیا ہے اور مختار مسعود نے جس کا خلاصہ اس طرح بیان کیا ہے —— "مسئلہ زیرِ بحث پر خوب سوچیے اور جب موضوع پر پوری گرفت ہو جائے اور اس کا خاطر خواہ خاکہ ذہن میں آ جائے تو پھر اس کے جز بنائیے، یہاں تک کہ وہ اکائی آ جائے کہ جس پر آپ پڑھنا بند اور لکھنا شروع کر دیں"۔

"پرورشِ لوح و قلم" کا دوسرا طریقہ ہم سے "اہلِ توکل" کا ہے کہ ؎

ذوق اس بحرِ فنا میں کشتیٔ عمرِ رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا۔

یعنی جب کبھی لکھنے کی "ایمرجنسی" (EMERGENCY) لاحق ہوئی قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا اور جب تھکنے پر، معلومات، حافظے یا ہاتھوں نے جواب دے دیا۔ وہیں ہتھیار ڈال دیئے مگر جب "آوازِ دوست" کا مطالعہ کیا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اس میں خیال و فکر کی اکائیاں، "دہائیوں" کے حساب سے ملتی ہیں آپ جس کی بھی انگلی پکڑ لیں بیشک میلوں چلتے جائیے۔

خیال و فکر کی پہلی اکائی "انتساب" ہی میں دیکھ لیجیے، کتاب والدہ مرحومہ اور والد مرحوم کی یاد سے منسوب کی گئی ہے، نام سے نہیں، قبر سے۔ قبر بھی کہاں؟ "ایک پرکاہ" اور ایک

پارۂ سنگ کے نام۔ وہ "پرِ کاہ" جو والدہ مرحومہ کی قبر پہ اُگنے والی گھاس کی پہلی پتی تھی" —— اور وہ پارۂ سنگ" جو والد مرحوم کا لوحِ مزار ہے"۔ "انتساب" پڑھ کر مجھے تو ایسا لگا جیسے گھاس کی وہ ننھی سی پتی جو سینکڑوں من مٹی کا سینہ چیر کر ابھر آئی تھی، بیٹے کے لیے ماتا کی دعا بھی تھی اور پیغام بھی —— دعا کہ بیٹا تجھ کو پاک پروردگار زندگی میں ہمیشہ ہرا بھرا رکھے —— اور پیغام —— کہ زندگی کی نشو و نما کا عمل کبھی رُکتا نہیں۔

میرا چھوٹا بیٹا امتنان انٹرمیڈیٹ کے دوسرے درجے میں پڑھتا ہے وہ کرکٹ کے میدان میں کافی ہونہار اور ہمجولیوں کے حلقے میں خاصا مسخرا سمجھا جاتا ہے میں جب یہ کتاب پڑھ رہا تھا تو وہ باہر دالان میں کرکٹ کھیل رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلا کر "انتساب" کا صفحہ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ "انتساب کے لفظ سے تو وہ مانوس تھا البتہ "پرِ کاہ" اور "پارۂ سنگ" کے معنی اسے پوچھنے پڑے۔ معنی معلوم ہوئے تو چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر یکایک بولا —— "اباجی! یہ اپنے اباجی کو کبھی بھی آؤٹ (OUT) نہیں کرنا چاہتے" وہ یہ جملہ کہہ کر بھاگ گیا۔ جب اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں ایک ایسی گھٹا سی امنڈتی نظر آئی جو آجکل کی نسل کے بچوں میں کبھی کبھی ہی دکھائی دیتی ہے۔

دیباچہ نگاری میں آپ نے بالکل نئی شاہراہ کھولی ہے۔ یہ شاہراہ تو خیر کھلتے ہی بند ہو جاتی ہے یہ کہنا چاہیے کہ ایک نئے رُخ پر ادبی ٹریفک کھول دیا ہے مختصر دیباچے ہم نے پہلے بھی دیکھے ہیں لیکن اس جلیبیا "اُردو پر سفیدی" کے برابر دیباچہ ہماری نظر سے پہلے نہیں گزرا انہوں نے گویا۔ "السلام علیکم" کہہ کر کتاب کی کنجی قاری کے ہاتھ میں تھما دی ہے۔ کہ ع

اب مجھے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

ایجاز کا یہ انداز کتاب میں ہر جگہ موجود ہے۔ الفاظ کی کفایت سے ایسا لگتا ہے۔ کہ جیسے ان کو ایک ایک لفظ خرید کر لکھنا پڑا ہے۔ البتہ وہ لوگ جو گھنی اور گہری بات تک نہیں پہنچ سکتے وہ ممکن ہے کہ ان کے دیباچے سے یہی سمجھیں کہ آپ نے مشہور گلوکارہ تصور خانم کے گانے

ہوئے اس مقبول پنجابی گیت کو شکل اردو میں ڈھال دیا ہے، جس کے مکھڑے کے بول کچھ اس طرح سے ہیں ؎

اوئے میں کہیا گل سُن جا !
نئیں نئیں کُج نہیں !
جا ! ـــــ جا !

"آوازِ دوست" میں ان کے دو مضامین شامل ہیں۔ ایک تو وہی "مینارِ پاکستان" اور دوسرا "قحط الرجال" دوسرے مضمون میں انہوں نے چند ممتاز و نامور شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ شخصیتیں مختلف ہیں مگر کہانی مربوط ہے۔ شخصیتوں کی حکایت ان کے "آٹو گراف البم" کے ساتھ ساتھ گھومتی ہے جو آپ نے ۱۹۲۵ء میں علیگڑھ کے ایک ہندو فوٹو گرافر ورما کی دوکان سے چھ آنے میں خریدا تھا۔ ان سے متعلق دو ایک ذاتی باتیں بھی یہیں سن لیجیے ـــــ آپ شہرِ اقبال میں پیدا ہوئے ذہنی طور پر رہائش بھی شہرِ اقبال میں رکھتے ہیں پہلی سے سولہویں جماعت تک جو کچھ بھی پاس کیا، علیگڑھ میں پاس کیا۔ جہاں ان کے نامور والد "اقبال نامہ" کے فاضل مؤلف پروفیسر شیخ عطاء اللہ صاحب مرحوم اقتصادیات کے استاد تھے۔ علیگڑھ میں آپ طلبہ کی اس نسل میں شامل تھے جس نے قائداعظم کی بگھی کھینچی تھی۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ریل گاڑی روکی تھی۔

علیگڑھ اسلامی ہند کا مصروف ترین علمی اور تہذیبی گہوارہ تھا۔ ہر ریل گاڑی سے اگر دو مشاہیر وہاں اترتے تھے، تو چار سوار ہوتے تھے، مشاہیر بھی سولہ آنے کھرے مشاہیر کہ ان میں جیساکہ مختار مسعود نے بڑے آدمیوں کی شناخت کے سلسلے میں لکھا ہے۔ "ایک پوری نسل اپنا سراپا دیکھ لے"۔ آج کی طرح کے محض "مشتہر مشاہیر" نہیں کہ جنکی شہرت میں ان کے بقول "حرف قوت خرید کو دخل ہوتا ہے"۔ علی گڑھ میں تو البم کی "ذخیرہ اندوزی" کی رفتار خاصی تیز رہی مگر قیامِ پاکستان کے بعد اس میں وہ گہما گہمی نظر نہیں آئی۔ کچھ تو اب لوگ ہی چھوٹے ہوگئے ہیں

اور کچھ اتنے میں یہ خود بڑے ہو گئے تھے۔ پاکستان میں قحط الرجال کے سناٹے کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے "پہلے بیس سالوں میں بائیس صرف افسر اور تاجر جنتی رہیں" اقبال نے بہت پہلے اس حقیقت کی نشاندہی اس طرح فرمائی تھی ؎

وائے آں، قومے کہ سلطاں زاد و درویشے نہ زاد

کتاب میں جن جن لوگوں کا تذکرہ آیا ہے، وہ سب لوگ ان کے "ہیرو" نہیں ہیں۔ مجھے تو ان میں صرف ایک شخصیت نظر آتی ہے۔ جس کی راہ میں دیدہ و دل بچھائے ہوئے انہوں نے اپنے پاس کچھ بچا کر نہیں رکھا، وہ ہے قائدِ اعظم کی شخصیت۔ مسلسل تذکرہ ان کا بھی چند صفحوں سے زائد نہ ہو گا۔ مگر ان کی خوشبو پوری کتاب میں بسی ہوئی ہے۔

شخصیات کی فہرست سے ان کی ذہنی ترجیحات کی نشان دہی یقیناً ہوتی ہے۔ دو چار کے سوا باقی سب اصحاب برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے ستون تھے۔ حق گوئی اور بیباکی ان کا شیوہ تھا، خدا اور خدا کے رسولؐ کے فدائی، حریت خواہی اور حق گوئی کے لیے جس نے جتنی زیادہ ابتلا برداشت کی، وہ اتنے ہی زیادہ نمبروں پر پاس ہو رہا ہے۔ درویشوں اور قلندروں اور شاعروں کی لین ڈوری لگی ہوئی ہے۔

ان بوریا نشینوں میں نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال کو دیکھ کر قدرے تعجب ہوتا ہے مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال جیسے مردِ قلندر نے "ضربِ کلیم" میں اپنا تمام تر سرمایہ بہاری حمید اللہ خان کے نام منسوب کر رکھا ہے تو یہ تعجب دُور ہو جاتا ہے۔ اصل حقیقت غالباً وہی ہے جس کی طرف مختار مسعود نے اس طرح اشارہ کیا ہے۔ کہ بڑے آدمی ——— "الحکم کی طرح بادشاہ بھی ہوتے ہیں اور اقبال کی طرح درویش بھی"۔ ضرورت دراصل ایسے آئینوں کی ہے کہ ——

دیکھ سکتے ہوں جو باطن کو بھی ظاہر کی طرح!

پھر سو باتوں کی ایک بات یہ کہ حمید اللہ خان اپنی والدہ سلطان جہاں بیگم کے قدموں میں دفن ہیں۔ والدین کے لیے تقدیس و تکریم، ارادت و محبت کا جذبہ مختار مسعود کے نظام زندگی پر

اہم مقام رکھتا ہے، اس کی ایک جھلک ہم "انتساب" میں دیکھ چکے ہیں۔ اقوام متحدہ کے
سیکرٹری مسٹر او تھانٹ لاہور ائرپورٹ پر ان کے پہلو میں بیٹھے رہے مگر ان کے دل میں
ان کے آٹوگراف لینے کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ البتہ کئی برس بعد جب ایک جاپانی رسالہ
میں انہوں نے او تھانٹ کی ایک تصویر دیکھی کہ وہ برما میں اپنے آبائی گاؤں میں ہیں" ان کی
سادہ بوڑھی ماں اپنے سادہ سے دیہاتی کرتے لاچے میں ملبوس ایک اونچی کرسی پر ننگے پاؤں
بیٹھی ہے۔ اور او تھانٹ ماں کے قدموں میں سجدہ ریز پڑا ہے۔ تو وہ دن اور آج کا دن
ستار مسعود اس موقع کا انتظار کر رہے ہیں کہ او تھانٹ کہیں انہیں مل جائیں اور یہ البم
کھول کر ان کے سامنے رکھ دیں۔

خطابت سے چونکہ آپ خود گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ لہٰذا خطابت کا غیر معمولی جوہر ان کے
اکثر ممدوحین میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ سروجنی نائیڈو کی تربیت میں اگرچہ انہیں
"گنگا جل سے زیادہ زم زم کی تاثیر" نظر آتی ہے لیکن وہ "بلبل ہند" ہونے کی وجہ سے بھی
"داخل حسنات" ہو گئی ہیں۔ مغربی مشاہیر میں سے (PASSAGE TO INDIA) کے مصنف
مسٹر فاسٹر (FOSTER) اور پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی ہیں۔ فاسٹر کے انداز تحریر میں چابکدستی
در ایجاز کا اعجاز ____ انہیں مرغوب ہے، پھر یہ بھی کہ فاسٹر صاحب کو مسلمانوں کی
مسجدیں پسند تھیں اور علی گڑھ بھی پسند تھا۔ اور علی گڑھ کی محبت ان کے ہاں کوئی ضمنی چیز
نہیں ہے۔ علی گڑھ کی ٹوپی اور شیروانی کو وہ تحریک پاکستان اور مساواتِ اسلامی کا سمبل
سمجھتے ہیں ان کے نزدیک ____ قائدِ اعظم کا ظہور درس گاہِ سرسید اور شعرِ اقبال کی وجہ سے
ممکن ہوا ہے۔ "آوازِ دوست" میں وہ اپنی جن محبتوں کو آوازیں دیتے ہیں، ان میں ایک
محبت کا نام علیگڑھ بھی ہے ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان میں علی گڑھ سمیت واپس آئے ہیں۔

پروفیسر ٹائن بی سے ان کی ملاقات ملتان میں ہوئی۔ گویا کنواں خود چل کر پیاسے کے
پاس آگیا۔ کتاب میں قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی جو بحث اٹھائی گئی ہے۔

اس میں ٹائن بی کا تذکرہ یوں بھی ناگزیر تھا۔ کہ موصوف کے حوالے کے بغیر عروج و زوال کا کوئی "گراف" سمجھ میں ہی نہیں آتا۔

شخصیتوں کے انتخاب میں وہ شروع سے ہی ایک خاص "پیمانۂ امروز و فردا" سے "لیس" نظر آتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کے آپ معترف ہیں، ادبی لحاظ سے "آوازِ دوست" کی قریب ترین مماثلت اگر کسی کتاب میں ملتی ہے تو میرے خیال میں وہ "غبارِ خاطر" ہے یہ آوازِ دوست" ہے وہ دوست کے نام خطوط ہیں ان کا اپنا اسلوبِ نگارش بھی بالخصوص لسانی تشکیلات کے شکوہ اور تمکنت میں مولانا آزاد کے اسلوبِ نگارش کا "دستار" بدل بھائی" معلوم ہوتا ہے لیکن ۱۹۴۸ء میں جب مولانا آزاد وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے علیگڑھ آئے تو مختار مسعود نے ان کے ہاتھ سے ایم اے کی ڈگری مع تمغۂ امتیاز تو وصول کر لی لیکن اپنے البم میں مولانا کے آٹو گراف کے لیے کوئی تحریک ان کے دل میں نہ پیدا ہوئی۔

ان کے شخصی تذکروں کو معروف انداز میں لکھے ہوئے سوانحی خاکے کہنا شاید درست نہ ہو یہ تاثراتی جائزے بلکہ زاویے ہیں۔ ان کے کسی ممدوح کے بارے میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ موصوف ناشتے میں انڈا کھاتے تھے یا نہیں۔ ان کے ہاں مولانا ظفر علی خان ایک جذبے کا نام ہے مولانا حسرت موہانی ایک طرزِ زندگی اور بہادر یار جنگ ایک تحریک ہیں۔

قائداعظم کے پیچھے شہاب الدین غوری تک ہماری پوری تاریخ اور "مینارِ پاکستان" کے پیچھے مسجد بنی امیہ کے مینار تک نہ جانے کتنے مینار جھانکتے دکھائی دیتے ہیں انھوں نے شخصیتوں کے ناموں کے اوپر علیحدہ علیحدہ باب باندھ کر تذکرہ نہیں لکھا کیوں کہ ان کے نزدیک "اگر ایک بے بہا جذبے کا عنوان دے دیا جائے تو اس کی قیمت گر جاتی ہے۔"

"آوازِ دوست" ایک علمی اور فکری کاوش ہے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس کی بنیادی اکائی مختصراً یہ ہے کہ ایک قوم کی حیثیت سے ہم کون ہیں؟ ہم کیوں ہیں اور اس ضمن میں وہ اس نظریے پر ایمان رکھتے ہیں کہ —— مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ ہی نسل ہے" مزید برآں یہ بھی کہ —— "نظریے کی جگہ دل میں ہے اور مملکت

کی نقشے پر، سرحدیں مختلف ادوار میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ نظریہ تو بنیاد ہے جو ہمیشہ کے لیے بھری جا چکی"۔

مختار مسعود کی باتوں میں قطعیت کی دھوپ تیز رہتی ہے وہ دھند میں "ٹینس کھیلنے" کے قائل نہیں ہیں پوری کتاب میں کوئی ایک جملہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کی داڑھی چوٹی میں الجھی ہوئی ہو۔ وضاحت اور ذمہ داری ان کی تحریر کا خاصہ ہے مگر یہ کتاب تو انہوں نے جیسے تاریخ کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر لکھی ہے۔ الفاظ جیسے ناقص وسیلۂ ابلاغ و اظہار کو کامل طریق پر استعمال کرنا بڑی ریاضت اور جاں کاہی کا آرٹ ہے۔ مختار مسعود کو اس آرٹ پر غیر معمولی دسترس حاصل ہے۔ ایک ادا ان کی یہ بھی ہے کہ شاہراہ پر چلتے چلتے اچانک بغل کی کسی گلی میں نکل جاتے ہیں۔ دو ایک لمحوں کے لیے ایسا بھی لگتا ہے کہ مینار کے کواڑ مقفل کر کے مسجد قرطبہ کی طرف چلے گئے ہیں، لیکن درحقیقت وہ اپنے نصب العین کو ایک لمحے کے لیے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور نفس مضمون پر ان کی گرفت اتنی مضبوط اور مسلسل ہوتی ہے کہ جیسے شیر شاہ سوری ــــــ ہمایوں کا تعاقب کر رہا ہو۔

مینار کی رُوداد ہو یا افراد کی حکایت، وہ ان کا تذکرہ تاریخ بن کرتے ہیں۔ علم تجربات کو یاد رکھنے کا نام ہے ان کا حاضر باش حافظہ، فکر انگیز اور دلچسپ معلومات و حکایات۔ تجربات و مشاہدات کا ایک وسیع مگر منظم "آرڈیننس ڈپو" ہے اور وہ اپنے بیان میں اس ذخیرہ علم و خبر کی چاشنی اور چمک کچھ ایسی چابکدستی سے گھولتے چلے جاتے ہیں کہ اگر ایک اینٹ مینار پر رکھتے ہیں تو دو پھول قاری کے ذہن میں کھل اٹھتے ہیں ہر چوتھی یا پانچویں سیڑھی کے بعد ایک دریچہ تاریخ و تہذیب کے نخلستانوں کی طرف کھول دیتے ہیں، مینار کے علاوہ وہ پوری دیوار گھما لاتے ہیں۔ مگر جب ہم مینار کی "سربرجی" میں پہنچتے ہیں۔ تو یوں لگتا ہے جیسے تین سو سیڑھیاں، قدم بہ قدم، چڑھ کر نہیں آئے بلکہ "لفٹ" میں بیٹھ کر آ گئے ہیں۔

شخصیتوں کے باب میں بھی اگرچہ براہِ راست روئے سخن تو چند اکابر ہی سے رکھا ہے

مگر وقفہ بہ وقفہ "غیر حاضر مشاہیر" بھی تشریف لاتے رہتے ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ مشہور و معروف لوگ، اہلِ کمال اور اہلِ جمال یونہی چھڑی گھماتے ہوئے ٹہلتے ٹہلتے اتفاقاً ادھر آنکلے ہیں جو کوئی آتا ہے اس کے ہاتھ میں دانش و حکمت کی لالٹین ہوتی ہے۔ یا حسن و خوبی کا گلدستہ اور وہ جلد جلد کچھ روشنی دکھا کر یا چند پھول دے کر تاریخ کے صفحات میں لوٹ جاتا ہے۔ مثلاً ابوالفتح ہمدانی کی آمد سے پتہ چلتا ہے۔ کہ صاحب موصوف جن دنوں "جامع التواریخ" لکھ رہے تھے وہ کوئی فری لانس (FREE LANCE) منشی نہ تھے بلکہ اپنے ملک کے وزیر اعظم تھے، ایک غیر معروف شخص کی ایک بات سن کر تو ہم دنگ ہی رہ گئے۔ بلکہ کچھ آزردہ بھی ہوئے اس شخص نے سر ونسٹن چرچل کی جوانی کے زمانے میں ان کے بارے میں کہا تھا ــــ "کچھ عجب نہیں کہ چرچل کسی روز انگلستان کی شکست اور انگلستان کے درمیان حائل ہو جائے" اس پر ہمارے دل سے بے اختیار آواز آئی ــــ "اے کاش! ہمیں بھی کوئی ایسا شخص میسر آتا۔ جو پاکستان کی شکست کے درمیان حائل ہو جاتا۔" یہ تو خیر سرراہے ایک بات آگئی کہنا یہ تھا کہ وہ اپنے ہوا کی طرح کے سبک سیر اندازِ بیان میں بھاری بھرکم مضامین کو ایسے لطیف و دل کشا پیرائے میں ادا کر جاتے ہیں کہ آگہی تو ہوتی ہے، بوجھ نہیں ہوتا۔ ایک آدھ مقام پر ذائقے میں ذرا سی گرانی اور سلاست میں قدرے سلوٹ محسوس ہوتی ہے مگر

ناصحو! پند گرو! راہگذر تو دیکھو!

یہ مقام فلسفہ و فکر کی سنگلاخ گھاٹیوں سے اٹا ہوا وہ مقام ہے جہاں پروفیسر ٹائن بی کے ساتھ قوموں کے عروج و زوال کی "تیغ بردست و کفن در آستیں" بحث چل نکلی۔ پھر یوں بھی یہ کتاب مجھ ایسے طنز و مزاح کے "گھس بھکوں" کی تفریح طبع کیلئے تو کبھی نہیں گئی یہ تو اس قوم کے غور و فکر کے لیے لکھی گئی ہے جس کا جسم شکست کے زخموں سے لہولہان ہے "آواز دوست" دراصل اس نغمۂ بے تاب کا ایک آہنگ ہے جس کے اندوہ کی نشان دہی اقبال کے ہاں اس طرح ملتی ہے ؎

نغمہ ام خوں گشتہ و از رگ ہائے ساز آید بروں

یہ کوئی ضروری نہیں کہ ان کے بھی افکار و آراء سے اتفاق کیا جائے۔ علمی و فکری مباحث میں اختلاف و تاویل کی گنجائش ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔ انہوں نے خود دوسروں کے افکار و آراء سے اختلاف کیا ہے پروٹوکال (PROTOCOL) کی باریکیوں کا اگرچہ وہ اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ مثلاً انہوں نے اپنے البم میں چواین لائی کے دستخط محض اس لیے نہیں لیے کہ پہلے ماوزے تنگ کے دستخط ہو لیں تو چواین لائی کے دستخط ہوں۔ دوسروں کے نقطۂ نظر پر بھی وہ ہمدردانہ نگاہ رکھتے ہیں۔ لیکن تحریک و تصورِ پاکستان کے اساسی اصولوں پر کوئی مفاہمت وہ ہرگز نہیں کرتے۔ ان کی اس "ذہنی محاذ آرائی" کا کچھ اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرے سے ہوتا ہے۔ بہرحال جہاں تک ہمارے ملی تشخص کے خدوخال تصورِ قومیت کے بنیادی عوامل، اور نظریہ و مملکت کے بنیادی رشتے کا تعلق ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ نے اس موضوع پر نہایت مؤثر اور مدلل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ آج ہم اپنی تاریخ کے بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ ایسا مرحلہ ہے جس میں کسی قوم کے اجتماعی ذہن کے کہر آلود ہو جانے اور قومی محور سے ٹوٹ جانے کا اندیشہ لاحق ہو سکتا ہے۔ مستقبل کے لیے ایک نیا اعتماد پیدا کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اس اہم ملی فریضے کو بڑے محرمانہ انداز سے پورا کرتی ہے۔

موضوع کی نسبت سے کتابوں کی بزرگی اور افادیت سر آنکھوں پر۔ لیکن میں ذاتی طور پر قارئین کے جس قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس کے نزدیک کتابیں صرف دو ہی قسم کی ہوتی ہیں ـــــ اچھی لکھی ہوئی یا بری لکھی ہوئی، تحریر میں علم کے وزن کے ساتھ ساتھ اگر ادب کی چاشنی بھی موجود ہو تو وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی طرف پنجابی زبان کے غیر فانی شاعر حضرت میاں محمد بخش صاحبؒ نے اس طرح اشارہ فرمایا ہے ؏

دودھ اندر جاں کھنڈ ملائیے مٹھا ہوندا دونا

لیکن جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح کسی تحریر میں علمی ثقاہت اور ادبی لطافت کم ہی شیر و شکر نظر آئیں گی، عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جو تصنیف فکر میں اونچی نکل گئی وہ فن میں نیچی رہ گئی مگر "آوازِ دوست" بیک وقت ایک خیال انگیز علمی کاوش بھی ہے اور ایک نہایت دلکش ادبی کارنامہ بھی۔ اور یہ اعجاز ہے ان کے اسلوب نگارش میں شکوہ اور شگفتگی کے فنکارانہ امتزاج کا۔ ان کا شکوہ بھی اگرچہ ایک طرح کی ریشمی ملائمت کا بنا ہے جو خوبصورت چیزوں کو خوبصورت پیرہن عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان کے اندازِ تحریر کی سب سے نمایاں خوبی شگفتگی کی وہ رواں دواں لہر ہے جس کی بدولت وہ حکیمانہ نسخوں کو ادیبانہ زبان میں اور "مرنے کی رُوداد کو زندگی کے لہجے میں" بیان کر گئے ہیں یہ ان کی نثر کی اس متبسم بانکپن کا کرشمہ ہے کہ "مینارِ پاکستان" کے مقالے میں اقلیدسی شکلوں، رنگیں لوحوں، غالب کاری، خاتم کاری کی باریک باریک تفصیلات کے باوجود مینار سے لپٹے کو جی چاہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ مزاح کو وہ اپنی سنجیدہ نثر کے "اردلی" کے طور پہ استعمال کرتے ہیں کہ جہاں ضرورت پڑے وہ آگے بڑھ کر وردی استری کر دے پٹی کس دے یا پیٹی چمکا دے۔ لیکن میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ ان کی قدرتی آواز مزاح میں سنائی دیتی ہے۔ میرا پکا یقین ہے کہ وہ اگر اس صنف کو کھلے دل سے "کلاوہ مار کر" اپنی طرف کھینچ لیتے تو اردو ادب کو رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کے محاذ پہ ایک اور اپنے علیحدہ جھنڈے والا جرنیل میسر آجاتا۔ مگر مختار مسعود اپنی جگہ اس بات پہ پکا یقین رکھتے ہیں کہ ـــــ "ہر شخص وہی ہوتا ہے جو وہ بنتا ہے۔ اور ہر انسان صرف وہی بن سکتا ہے جو وہ ہوتا ہے"

"آوازِ دوست" کی اشاعت سے اردو نثر کو ایک نئی توانائی اور نیا اعتماد ملا ہے انہوں نے اردو نثر کے خوبصورت ترین پھولوں سے بوند بوند رنگ اور رس اور خوشبو جمع کر کے بات کہنے کا ایک نیا سلیقہ پیدا کیا ہے وہ اپنے جملوں کو ہیروں کی طرح تراشتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ بڑی سے بڑی بات ایک جملے بلکہ ایک لفظ میں ادا ہو جائے۔ ان

کا بس چلے تو اوّل سے آخر تک ضرب الامثال لکھتے چلے جائیں۔ ان کے فقرے ان کے مافی الضمیر کے منجھے ہوئے سفیر ہوتے ہیں وہ ایسے ایسے معرکۃ الآرا جملے لکھتے ہیں کہ اس عہد تن آسانی میں اس طرح کے جملے لکھنے کا رواج ہی اٹھتا جا رہا ہے۔ پیر و مرشد مولانا صلاح الدین احمد کے بعد ایک بار پھر ان کے اسٹائل کی چھب اور طرحداری نے اردو نثر کو اردو شاعری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے قابل بنا دیا ہے۔ "آوازِ دوست" پر تبصرے کی بہترین اور آسان صورت یہ تھی کہ آدمی کتاب میں سے اقتباسات نقل کرتا چلا جائے لیکن اس کانِ جواہر میں سے چند جملے چھانٹ کر "اقربا پروری" کا الزام کیوں مول لے؟ اور پوری کتاب کی حق تلفی کیوں کی جائے؟ میرا پختہ یقین ہے کہ جس زبان میں اس پایہ کی کتابیں لکھی جا سکتی ہوں اس کا مستقبل محفوظ اور اس کا ادب سربلند ہو جاتا ہے۔

اپنے تنوع اور توانائی کے لحاظ سے "آوازِ دوست" کو "علم و ادب کا گنج" کہا جانا ہوگا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ لائبریرین اس کتاب کو کون سے خانے میں رکھے گا۔ لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب پاکستان کے ادب و تہذیب سے محبت رکھنے والے لوگوں کے "خانۂ دل" میں رہا کرے گی۔

میرے بچپن کے دنوں میں ہمارے گاؤں میں بابا فاضل شاہ کے کھیت میں بیری کا ایک قدآور درخت ہوا کرتا تھا۔ پھل کی رُت آتی تو اس کی شاخیں بیروں سے اس طرح بھر جاتیں کہ پتوں کی جگہ بھی بیر ہی بیر دکھائی دیتے۔ درخت کی جڑیں اپنی سوندھی سوندھی زمین میں بہت گہری بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس کے بیر بہت بھی ہوتے تھے۔ اور بہت میٹھے اور سڈول بھی مجھے "آوازِ دوست" کے ہر صفحے پر بیری کا وہی بوٹا دکھائی دیتا ہے۔

(یہ مضمون ۲۷ جنوری ۱۹۷۳ء کو راولپنڈی میں "آوازِ دوست" کی افتتاحی تقریب میں پڑھا گیا)

اُردو ادب کا جنرل رومیل

کرنل محمد خان کی کتاب "بجنگ آمد" کی آمد آمد کا "بگل بجانے کے لیے، جناب الطاف حسن قریشی (مدیر اردو ڈائجسٹ) نے آج جس تقریب کا اہتمام کیا ہے، اس میں کتاب کے مندرجات کے علاوہ، کرنل صاحب کی "وردی" یعنی ان کی شخصیت کا بھی جائزہ لیا جائے گا اور یہ فریضہ میرے اور کیپٹن (اب میجر) صدیق سالک کے سپرد ہوا ہے۔ تاکید یہ کی گئی ہے کہ ہم دونوں سپاہی، اپنی اپنی "روند" سے ادھر اُدھر نہیں ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے کرنل صاحب کو دو الگ الگ حصوں یا ابواب میں تقسیم کر کے ایک ایک باب ایک ایک آدمی کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ "بجنگ آمد" سے پہلے کا محمد خاں مجھ کو، اور بقیہ محمد خان ____ صدیق سالک کو "الاٹ" ہوا ہے

غم مجھ کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

غم کا لفظ مصرعے میں بندھا ہوا بندھ گیا۔ ورنہ محمد خان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ سفر کرنا شگفتگی سے قدم بقدم نخلستان میں سفر کرنا ہے۔ لیکن اس "بادردی موضوع" سے عہدہ برا ہونا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں۔ شخصیت کا رقبہ تو دیکھیے کہ کہاں سے کہاں تک پھیلا ہے؟ میری لائن آف کمیونیکیشن (LINE OF COMMUNICATION) اتنی طویل اور کہیں کہیں اس قدر باریک اور دشوار گذار ہے کہ بعض علاقوں سے میں گزر بھی نہیں سکتا۔ سو یہ جائزہ گویا ہوائی جہاز سے ایک چھچلتی ہوئی سی نظر کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہر شخص کی طرح، کرنل محمد خان کی شخصیت بھی، اپنے ماحول کی روایتوں، روشنیوں مٹی، ہوا اور پانی ہی سے صورت پذیر ہوئی ہے۔ میرے خیال میں، ان کی زندگی کو تین ادوار

ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کاشت کاری کا دور، " دریا باری" کا دور اور خوش نگاری کا دور

کاشتکاری کے دور کا شباب یوں تو ان کے عنفوانِ شباب کے بعد، ختم ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کی چاہت اور خوشبو چونکہ ان کے خمیر میں رچی ہوئی ہے اس لیے یہ دوران پہ ہمیشہ طاری رہے گا۔ یہی دھارا آگے چل کر سپہ داری کے دریا میں شامل ہو گیا۔ کرنل محمد خاں کا آبائی گاؤں "بل کسر" علاقہ دھن کی مشہور وادی میں، چکوال سے کوئی دس بارہ میل دور، کوہستانِ نمک کے پڑوس میں واقع ہے۔ یہ وادی جفاکش کاشت کار، سنہری گندم اور جیالے سپاہی پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ سے ممتاز چلی آتی ہے یہ ریکارڈ تو میرے پاس موجود نہیں کہ اس خطے میں ان کی سو پشتیں پوری ہو چکی ہیں یا نہیں مگر جتنی پشتیں بھی گزر چکی ہیں ان کا پیشہ سپہ گری رہا ہے زراعت سے ملی ہوئی سپہ گری۔ نظیری کا یہ غیر فانی مصرعہ

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ مانیست

ان لوگوں پہ اتنا فٹ ہو کر صادق آتا ہے کہ اگر خود ان کے قبیلے میں نظیری سے پہلے فارسی کا کوئی جید شاعر پیدا ہو جاتا تو وہ یقیناً یہ مصرعہ کہہ کر وفات پاتا۔ زندگی کی فضا، سادہ اور کھلی، خوبصورت اور دل کش مگر سخت و سنگین بھی۔ تیس پینتیس برس پیشتر وہاں کم لوگ ہوں گے جو تعلیم کے میدان میں، محمد خان کی طرح ایم اے تک یلغار کرتے گئے ہوں لیکن یہاں کا محمد خان اندر سے خواہ کتنا ہی تبدیل ہو جائے۔ باہر سے وہی محمد خان رہتا ہے۔ کھیت میں ہل جوتنے والا محمد خان، کبڈی کے پڑ میں دھوم مچانے والا محمد خان، جنگ کے میدان میں بجلی کی طرح کوندجانے والا محمد خان!۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کرنل محمد خان، اپنے علاقے میں، اپنی قسم کے پہلے محمد خان ہیں۔ سوچیے تو سب سے الگ، سب سے مختلف۔ دیکھیے تو دوسرے محمد خانوں کی طرح عام محمد خان ؎

تم جس جگہ پہ چھوڑ گئے تھے وہیں ہوں میں

"دریا باری" کا دور، دوسری جنگِ عظیم میں دجلہ، فرات اور نیل کے کناروں پر گزرا۔

مدت کے اعتبار سے یہ دور گو بہت مختصر ہے مگر شیر شاہ سوری کے عہد کی طرح بڑا شاداب و زرخیز آپ فوج میں کمیشن لے کر اس وقت مشرقِ وسطیٰ کے محاذ کے سپرد ہوئے جب نامور جرمن سپہ سالار جنرل رومیل نے انگریزوں کو سنگینوں پہ اٹھا رکھا تھا۔ مگر پھر اس وسیع جنگ نے، جو بیک وقت تقریباً آدھی دنیا میں لڑی جا رہی تھی ہمارے نوجوان افسروں پہ ایک اجنبی دنیا کی رنگارنگ زندگی کے دروازے بھی کھول دیتے تھے۔ مختلف تہذیبوں کے ملاپ اور تصادم سے باہمی روابط کے نئے نئے زاویے اُبھر رہے تھے۔ عسکری زندگی کی اس روایت کے طفیل، کہ موت برستی رہے۔ مگر زندگی ہنستی رہے عقب کی لشکر گاہوں میں، خوشدلی اور شگفتگی کے آبشار رواں رہتے۔ بعض مستقل محاذوں پر تو دیسی افسروں کے مستقل جھرمٹ اور نخلستان قائم ہو گئے تھے۔ جن کے لطائف وظرائف اور نکتہ طرازیوں کی داستان بجائے خود لکھنے کے لائق ہے ملایا میں میجر چراغ حسن حسرت میر مجلس تھے۔ مشرق وسطےٰ میں بریگیڈیر گلزار احمد اس انجمن کے صدر نشین تھے، کرنل محمد خان چونکہ بولنے سے زیادہ سننے اور دیکھنے کے قائل تھے، اس لیے وہ جب وطن کو لوٹے تو اس زندگی کے بہت سے پھول اور ستارے بھی اپنے دامن میں سمیٹ لائے۔

قیام پاکستان کے بعد جب مجھے راولپنڈی میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ آپ لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ پھر جلد ہی فل کرنیل ہو گئے میں کپتان تھا اور سرخ فیتے والے کرنیل کا سامنا کرنے سے خاصا گھبراتا تھا۔ مگر وہ بڑے ہی تپاک سے ملے۔ ایسا تپاک جو قدر دانی کے راستے سے نکل کر آیا ہو۔ سامنے کی کرسی پر "اٹن شن" بٹھانے کی بجائے ایک گوشۂ عافیت میں رکھے ہوئے صوفے پر لے گئے۔ چائے منگوائی اور پھر چائے میں گھول گھول کر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے کم گو مگر متبسم، سنجیدگی میں گندھا ہوا، حجاب آلود سا تبسم۔ طبیعت تجب اُ... حد تک ملائم۔ اوپر کی اَنی تلوار والے سپاہیوں کی طرح سخت۔ ان کی ظرافت، جس نے آگے چل کر اردو ادب کو چمکا دیا، اس وقت کہیں "کوارٹر گارڈ" میں بند تھی۔ بعد

رفتہ رفتہ کھلا کہ ان کی طبیعت احباب کی محفلِ خاص ہی میں کھلتی ہے۔ عام گفتگو میں ان کے
ہاں ظرافت، موسلا دھار ہو کر نہیں برستی۔ لیکن ان کے ایک جملے سے بھی پھر بھی گلشن کا کاروبار
چل سکتا ہے۔ ایک مدت تک ان کے بارے میں یہی تاثر رہا کہ وہ ادب دوست ہیں، ادیب
نہیں ہیں۔ حالانکہ سرکاری فائلوں پر بڑی چلبلی انگریزی لکھتے تھے۔ یہ بہت آگے جا کر معلوم
ہوا کہ وہ تو بہت پیچھے یعنی اسکول اور کالج کے زمانے سے ادیب بلکہ شاعر چلے آ رہے
تھے۔ راستے میں نہ معلوم کیوں غوطے میں چلے گئے۔ اور بس نک سک سے درست، قاعدے
اور ڈھنگ کا ایک فوجی افسر ان کی جگہ رہ گیا۔ افسر اور انسان محمد خان کو بھی قریب سے
میں نے دیکھا ہے۔ ان کو ہر حالت میں پُرسکون، کشادہ ظرف اور خوددار پایا۔ ان کی نظر
ہمیشہ دو مردوں کے نکتہ نظر پر رہی۔ البتہ جہاں عزتِ نفس پر آنچ آنے کا اندیشہ ہوا۔ وہاں
سے وانگبین کی کوئی لاگ باقی نہ رہنے دی۔

وہ کم گو ہیں، مگر کم آمیز نہیں ہیں۔ البتہ دوستی کے بارے میں وہ قدرے محتاط ہیں
کہ ارتکابِ گناہ سہل مگر انتخابِ گناہ مشکل ہوتا ہے۔ دوست سے بجز محبت کسی چیز کی توقع
نہیں رکھتے، لیکن آپ خود دوستوں کی عزت و آسودگی کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ ایک مدت سے
دوستوں کے حق میں، اپنے آپ سے بھی دستبردار ہو چکے ہیں:

دستِ بجیب و پائے بہ داماں فشردہ ختم

زندگی کو وہ ایک بیش قرار نعمت، ایک بیکراں مسرت سمجھتے ہیں۔ غموں اور محرومیوں سے
ان کا دل خالی نہ ہو گا۔

مجھ کو خبر نہیں پسِ دیوار کیا ہوا

غموں سے شکستہ دل کبھی دکھائی نہ دیئے۔ جب دیکھا اپنے ایک ایک لمحے سے پُرشوق
قاتیوں کی طرح لپٹے دیکھا۔ لمحات کے اندر خود اپنی کوئی جھنک ہو یا نہ ہو، زندگی اور
انسانوں سے ان کا اپنا پیار، لمحات کے پاؤں میں جھانجھر باندھ دیتا ہے۔ جو شخص راولپنڈی

میں اپنی کوٹھی کے صحن میں، مرغی کے چھوٹے چھوٹے چوزوں کے ساتھ معصوم بچوں کی طرح پہروں
کھیل سکتا ہو۔ بل کسر میں، شام کے وقت اپنے چوبارے کے چھجے میں بیٹھ کر، چراگاہوں سے
واپس آتے ہوئے مویشیوں کی بجتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز پہ سر دھن سکتا ہو اس شخص کے ظرفِ
مسرت کا بھلا کوئی اندازہ ہے؟

هم وحشیوں نے صحنِ گلستاں سے اے خزاں
تنکے بھی چن لیے کہ شریک بہار تھے

روزمرہ کی زندگی میں نفاست اور ترتیب کے اس حد تک عادی ہیں کہ مثلاً اگر کتابوں
کے شیلف سے کسی کتاب کی صراحی دار گردن، دوسری کتابوں سے آگے نکل آئے تو آپ اس
کتاب کے مصنف سے بھی بیزار ہو جاتے ہیں۔ جوتوں کی قطار ایک دم سیدھی ہی نہیں، جوتوں
کے رول نمبر کے مطابق بھی کھڑی ہوتی ہے۔ جب تک یہ تبادلے کے احکام جاری نہ فرمائیں۔
کیا مجال ٹوپی کے ہیڈ کوارٹر میں رومال، یا رومال کے مقام پر ٹوپی آکر بیٹھ جائے خوابگاہ کے
ایک کونے میں اگر آپ اندھیرے میں ہاتھ بڑھائیں تو چھڑی خود بخود آپ کے ہاتھ میں آجائے گی
حد یہ ہے کہ چائے پر ان کے ہاں جو پکوڑے براہِ راست کڑاہی سے نکل کر ساتھ ساتھ سپلائی
کیے جاتے ہیں وہ بھی گورکھا سپاہیوں کی طرح قد و قامت کے ایک ہی سانچے میں ڈھل کر آتے
ہیں۔ تمدنی لحاظ سے ان کے گھر کو زرق برق راولپنڈی اور سادہ و توانا بل کسر کا سنگم کہنا چاہیے
پورچ میں موٹر کھڑی ہے۔ عقب میں بھینس بندھی ہے، انگریزی شوربے (SOUP) پہ جان چھڑکتے
ہیں۔ مگر روٹی سیدھی تنور سے اچھل کر دستر خوان پر آنی چاہیے۔ ہر چیز میں ایسا سلیقہ، توازن
اور نفاست، کہ معلوم نہیں آدمی ان کی خوش ذوقی کی داد دے یا انتظامی صلاحیت کی بہر حال

ع یہ غنیمت ہے کہ زنجیر میں انہیں راس آگئیں

اب چائے کی سنیے! چائے سے ان کی رغبت عشق کی کیفیت رکھتی ہے۔ ایسا لگتا ہے
کہ انسانوں کے بعد، ان کے نزدیک، سب سے زیادہ فضیلت اسی چیز کو حاصل ہے لذت

احت کے علاوہ چائے کے ساتھ آپ نے ایک قسم کی تقدیس کا جذبہ بھی وابستہ کر رکھا ہے، جس
اؤ اور چاہت کے ساتھ چائے بناتے ہیں، اور پھر خود سپردگی سے پیتے پلاتے ہیں اس کو دیکھ
ریوں محسوس ہوتا ہے کہ چائے کوئی مشروب نہیں کوئی "انسٹیٹیوشن" ہے۔ جس کی اپنی روایت
ہے اپنے آداب ہیں، اس معاملے میں، وہ ان کلاسیکی انگریزوں کا مزاج رکھتے ہیں جو چائے
پیالی پر بیٹھ کر مالٹا اور جبرالٹر کی قسمتوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے، ان کی سب سے چہیتی خوشی
ہے کہ دوست بیٹھے ہوں۔ خوش گپیاں ہو رہی ہوں۔ اتنے میں گھڑی شام کے سات بجا سے
ر آپ ایک نعرہ مستانہ بلند کر کے سیف علی کو آواز دیں ــــــ "سین چائے لے آؤ"
اس آواز کے ساتھ سین مالا کوٹ کی ٹرالی چھوڑ کر خود "سین" (SCENE) سے
ب ہو جاتا ہے۔ اور چائے بنانے کا سارا اہتمام آپ بہ نفس نفیس خود سر انجام دیتے ہیں۔
لے چائے کا شجرۂ نسب بیان ہوگا پھر دو ایک مرتبہ پانی کا درجہ حرارت ٹٹولیں گے۔ اور پھر
یس ترین چائے کو، صورت و معنی کی لطیف ترین معراج پہ لا کر، خوبصورت چائنا کے
یب الطرفین پیمانوں میں ڈھالتے چلے جائیں گے اور اس کی ارغوانی رنگت کو کچھ اس
رزومندی کی نظر سے دیکھیں گے گویا بلبل، گلاب کو دیکھ رہی ہو۔ دوستوں کو چائے پیش
رتے وقت ان کے چہرے پر آسودگی اور فتحمندی کی جو چمک نظر آتی ہے، اس سے ایسا
تا ہے کہ آپ چائے نہیں، مسرتیں اور نیکیاں بانٹ رہے ہیں۔ اور پھر جب چائے کا
ورچل پڑتا ہے تو اس کم سخن شخص کے چہچہانے کا انداز دیدنی و شنیدنی ہوتا ہے چائے
ے ایک ایک جرعے کے ساتھ ؎

خسروا از دہلی۔ ظہیر از فاریاب آید بروں

سوسائٹی میں ابھی تک ان کی وہ مقبولیت تو نہ تھی جو "بجنگ آمد" کی اشاعت کے
مد ان کو حاصل ہوئی۔ تاہم اپنے عہدہ و منصب، اپنی خوئے مہمان نوازی اور ادائے دلنوازی
کے باعث ادبی و تہذیبی، سماجی اور مجلسی تقریبات میں ان کی مانگ اکثر رہتی تھی۔ تقریب سے

تو یہ لطف اندوز ہوتے تھے۔ لیکن تقریب میں قدم رنجہ فرمانے کی ساعت ان پہ سخت بھاری گزرتی۔ کوشش یہ کرتے تھے کہ کہیں میزبان ان کو دیکھ نہ لیں۔ کوئی خیر مقدم کرنے والا ان کو پکڑ کر آگے نہ بٹھا دے، عموماً دبے پاؤں کسی پچھلی صف میں جا کر بیٹھ جاتے اور پھر لوگ لاکھ اصرار کرتے رہیں۔ حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔

کرنل محمد خان کی ادبی شخصیت کی طرف سرسری سا اشارہ پہلے آچکا ہے کہ ایک طویل مدت تک انہوں نے اپنے اس جوہر کو ظاہر ہی نہ ہونے دیا۔ لیکن جب یہ حکایت عام ہوئی تو پتہ چلا کہ ان کو یہ عارضہ بچپن سے لاحق تھا۔ ثانوی جماعتوں میں چٹک مٹک مضامین لکھنے کے لیے اساتذہ اور طلبہ کے منظور نظر تھے۔ کالج میں پہنچ کر شعر بھی موزوں کرنے لگے کالج کے میگزین کے ایڈیٹر ہوئے، سنٹرل ٹریننگ کالج میں ان کی مزاحیہ شاعری کی دھوم تھی ابتدا میں جلدی جلدی دو تین تخلص آزما کر چھوڑ دیئے۔ دو ایک برس محمد خان نسیم بنے رہے آخر کار محض محمد خان رہنا پسند کیا۔ مگر یہ بات ان کے چند یارانِ مکتب ہی کو معلوم ہے۔

راولپنڈی میں ان سے ملاقاتوں میں بھی، ان کا رویّہ کچھ ایسا تھا کہ آدمی ان پر شعر و ادب کے ادا شناس ہونے کا گمان تو کر سکے، لیکن شاعر و ادیب ہونے کا گمان نہ کر سکے مطالعہ وسیع تھا ادب پاروں سے متعلق ان کے تبصرے، ان کے ارفع مذاقِ ادب کی نشاندہی کرتے تھے۔ خود ان کی شخصیت کے بعض تیور، ادب و شعر سے ان کے عملی لگاؤ کی شہادت دیتے تھے، مگر وہ اپنی زبان سے اس کی حامی کبھی نہ بھرتے، اور ہمیں قوی شبہ کے باوجود ایک ذمہ دار آدمی کی بات پر یقین کرنا پڑتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انھوں نے اپنا کوئی شعر یا مضمون سنانے کی خفیف سی خواہش بھی کبھی ظاہر نہ ہونے دی۔ فن کاروں کی دنیا میں ضبطِ نفس کی ایسی کامیاب مثال، ان سے پہلے ہماری نظر سے نہیں گزری تھی۔ ہم اندازہ ہی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی شخص کسرِ نفسی کے معاملے میں اتنا عظیم مبالغہ بھی کر سکتا ہے؟ چنانچہ، اپنی طرف سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہوئے تھے کہ آپ اہلِ علم اور اہلِ نظر لوگوں میں سے تو ہیں،

طباعی کا جوہر بھی وافر رکھتے ہیں مگر کچھ بات ہے کہ طبیعت ادھر نہیں آتی۔

اُردو ادب کو ہمارے دوست کرنل مسعود احمد کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انہوں نے عساکر پاکستان کے جریدہ "ہلال" کے لیے ان سے ایک مضمون لکھوا لیا۔ مضمون کا عنوان تھا "کوہستانِ جنگ"۔ یہی مضمون بعد میں "بجنگ آمد" کے دوسرے مضامین کا والدِ ماجد ثابت ہوا۔

"بجنگ آمد" کو جو ہمہ گیر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہے، وہ اردو کی بہت کم تصانیف کے مقدر میں آئی ہے۔ کرنل محمد خان نے ادب کو ایک چونکا دینے والے اسلوبِ نگارش اور احساسِ ظرافت سے آشنا کیا ہے ان کے بارے میں اگر مجھے صرف ایک ہی جملہ کہنے کی اجازت ہوتی تو میں وہی مشہور و معروف جملہ کہتا۔

"وہ آیا، اُس نے دیکھا، اس نے فتح کر لیا"

"بجنگ آمد" کی فضا، دوسری عالمی جنگ کی زندگی سے ماخوذ ہے اور یہ کتنا دلچسپ اتفاق ہے کہ شہرت و امتیاز کی نسبت سے، اس کے سپاہی مصنف کے لیے، اگر کسی مثال کی ضرورت ہو، تو یہ مثال اسی جنگ کے ایک نامور سپہ سالار جنرل رومیل میں نظر آتی ہے رومیل افریقہ کے صحرائی محاذ پر اچانک نمودار ہوا اور اس کی پیش قدمی کی رفتار نے دنیا کو حیران کر دیا۔ رومیل کو "جرمن ہائی کمان" سے کمک نہ ملنے کی ہمیشہ شکایت رہی کچھ یہی کیفیت، ادب کے میدان میں، کرنل محمد خان کی نظر آتی ہے، وہ ادب کے افق پر اچانک نمودار ہوئے۔ اور ایک ہی جست میں شہرت و محبوبیت کے بلند ترین مقام پر جا پہنچے اور ہاں ان کو بھی اپنے "آبائی ہیڈ کوارٹر" بلکسر سے کبھی خاطر خواہ ذہنی کمک نہ مل سکی۔ اس لحاظ سے کرنل محمد خان کو اگر اُردو ادب کا رومیل کہا جائے تو میرے خیال میں یہ کوئی بے محل مثال نہ ہوگی۔

ادب کے اس رومیل کے بارے میں ابھی، بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن یہ

احساس دامنگیر ہے کہ میں اب کپتان صدیق سالک کی سرحد میں گھس آیا ہوں۔ اور پھر یہ احساس بھی کہ اپنے پیارے دوست محمد خان کی شخصیت کے رنگ اور رس کی بقدرِ آرزو ترجمانی میرے ذہن کی توفیق اور میرے قلم کے بس کی بات نہیں ہے۔ ؎

شعرِ حسرت ہم نے یہ مانا کہ نازک ہے بہت
اس سے بھی کچھ بڑھ کے نازک ہے مگر خوشبوئے دوست

(۲۳ رمئی ۱۹۶۸ء میں بجنگ آمد کی تعارفی تقریب کیلئے لکھا گیا)

اُردُو شاعری کی خاتونِ اوّل

مثل مشہور ہے کہ اونٹ جب بھاگتا ہے، کتے کی طرف بھاگتا ہے محترمہ ادا جعفری نے جس دور میں اپنے اکھرے نام سے شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اگر کوئی لڑکی شاعری کرنے کا جگرا نکال ہی لیتی۔ تو وہ عموماً اخلاقی قومی یا نیچرل شاعری کا برقع اوڑھ کر اس کوچے میں نکلتی اور ڈری ہوئی ہرنی کی طرح کچھ اس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتی کہ سماج کے برقع میں سے اس کی شاعری کی صرف آنکھیں ہی دکھائی دے سکتیں۔ بہت ہوا تو بے احتیاطی کے کسی لمحۂ نادر میں شاعری کی تھوڑی سی پیشانی جھلک اٹھتی یا پلکوں کی چلمنیں اٹھتی گرتی نظر آجاتیں جو عموماً اٹھنے سے پہلے گر جاتیں۔ جس لڑکی کا شعر، ایک آنچ کے بقدر بھی زیادہ گرم ہو جاتا اس بیچاری کی شادی کے لالے پڑ جاتے تھے کہ باذوق بَر، برسرِ روزگار بَر سے بھی زیادہ کمیاب جنس ہے۔ لوگ اپنے شاعر بیٹے کو مشکل سے ہی برداشت کرتے ہیں۔ چہ جائیکہ شاعر بہو، گھر میں لے آئیں۔ میں اخلاقی، قومی یا نظریاتی شاعری کے روح اور جسم پر اثرات کا منکر نہیں۔ ادب میں بچوں کو سلانے والی لوریاں نہ ہوتیں۔ تو اولاد جیسی نعمت بھی کبھی قدر تکلیف دہ ہو جاتی؟ مقصود صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ سماجی ماحول نے ادب کو ریل گاڑی کی طرح، مردانہ اور زنانہ ڈبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ شاعری میں خواتین کے برسرِ بازار سُرخی پوڈر جمانے یا ساڑھی تبدیل کرنے کے عمل کو (جس پر فی زمانہ بعض شاعرات نے عمل شروع کر دیا ہے) شاید مناسب نہ سمجھا جائے کہ اس فن کی ایمائیت اور اشاریت کا خون ہوتا ہے، لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ عورت کو شاعری کے کسی "تہ خانے" میں بند کر دیا جائے اور یہ قدغن لگا دی جائے کہ آمد و رفت بڑی ڈیوڑھی سے ہوگی۔

مگر اداؔ کے یہاں، ان کی ابتدائی نظموں ہی میں جو ہم پنجاب کے لوگ ۱۹۴۰ء کے آس پاس اختر شیرانی کے رسالہ "رومان" مرزا ادیب کے "ادبِ لطیف" مولانا تاجور کے "شاہکار" اور بعض دوسرے رسائل میں پڑھتے تھے، عام ڈگر کی "لسانی شاعری" سے ایک واضح انحراف کی "چیک پوسٹ" (CHECK POST) نظر آتی تھی۔ ان کے بیشتر شعر ایسے ہوتے کہ جیسے بیساکھ کی دھوپ میں گیہوں کے سنہرے دانوں سے بھرے ہوئے، خوشے لہلہا رہے ہوں۔ ان پر نکھری ہوئی دھوپ کا سنہرا پن بھی چمکتا اور وہ گرد بھی جمی ہوتی جو اردگرد کی توانا، مگر دردمند زمین سے اٹھ کر ٹانڈوں اور خوشوں سے لپٹ جاتی ہے۔ اداؔ کے فکر و فن کا رُخ ابتدا ہی سے زندگی کی وسیع تجربہ گاہ کی طرف تھا۔ جیالے سیاحوں کی مانند، ناآزمودہ سمتوں کے سفر کا رُجحان ان کے ہاں بڑا نمایاں تھا۔ یہ بات ہمیں بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی تربیت قدیم طرز کی دینی اور تہذیبی روایات میں، سر و شانہ تک گھٹے ہوئے ماحول میں ہوئی تھی۔ بُرقع انہوں نے شادی کے بعد اُتارا۔ مجھ کو اداؔ کی شعری شخصیت کا پیکر ایک ایسی لڑکی کا لگتا تھا۔ جو بدایوں کے کسی بھی ٹم ٹم والے گھرانے میں نہیں، بلکہ جہلم کے ایک گاؤں میں میری پھوپھی زاد بہن زبیدہ کی طرح مٹی گارے سے لت پت کسی محنت کش خاندان میں پیدا ہوئی ہو، جو پنگھٹ سے بیک وقت پانی کے دو، دو گھڑے سر پر اٹھا کر لاتی ہو اور جس کے ہاتھوں پر درانتی سے فصل کی ستھریاں کاٹتے کاٹتے، نیلی نیلی چھلیاں جم گئی ہوں، مگر بدایوں کی یہ زبیدہ، نجانے کس طور لکھ پڑھ کر شاعری کرنے لگ گئی تھی۔ (مجھے آج تک معلوم نہیں کہ اداؔ بہن کا اصل نام کیا ہے) "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں اداؔ کی رُوح کے درد اور ان کے لہجے کی "للک" کی لہر کچھ اس انداز سے چلتی تھی۔

زندگی میرے لیے خواب نہیں، گیت نہیں
سوچتی ہوں کہ یہ حجلۂ تاریک ہے کیا۔

یہ گراں بارِ تسلسل

یہ حیاتِ جامد

جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال

کوئی روزن بھی نہیں، کوئی دریچہ بھی نہیں

زد پہ آندھی کے دیا کانپ رہا ہو جیسے

تھک کے افسردہ و ویران گزرگاہوں میں

آخری عہدِ وفا کانپ رہا ہو جیسے

اور یہ آنسو ہے کہ آنکھوں سے ڈھلکتا ہی نہیں

ہائے یہ ساغرِ لبریز چھلکتا ہی نہیں

زندگانی تھی کا کُل برہم آپ سُلجھائی، آپ اُلجھائی

منزلیں بڑھ کے خود قدم بنتیں ہیں ہی آغازِ رم نہ کر پائی

رُوح میں انتشار سا کیا ہے دِل کو یہ انتظار سا کیا ہے

اداؔ کا یہ لہجہ ابتداءً سوئی کا ناکہ تھا جسے انہوں نے رفتہ رفتہ نیزے کی انی میں تبدیل کر لیا۔ اداؔ نے شاعری کے اس تہہ خانے کی، جس میں عورت محصور تھی، کئی صدیوں کی چنی ہوئی سنگلاخ دیواریں توڑ کر، ہوا اور روشنی کے بہت سے نئے دریچے مہیا کیے ہیں ____ اور بس اداؔ کو انہی معنوں میں، اُردو شاعری کی خاتونِ اوّل کہتا ہوں۔

اُردو شاعری کی خاتونِ اوّل سے ہماری اولین ملاقات راولپنڈی میں ہوئی۔ پاکستان بھی نیا نیا بنا تھا۔ محترم نورالحسن جعفری صاحب نے سرکاری ملازمت اور بیاہتا زندگی میں نیا نیا قدم رکھا تھا اور وُہ ان دنوں نمبر ۵ مال روڈ راولپنڈی پر، جہاں اب پی آئی اے کی عمارت

واقع ہے، اپنے پھوپھا، آرمی میڈیکل کور کے محترم کرنل عون محمد جعفری صاحب کے کشادہ بنگلے کے ایک حصے میں مقیم تھے۔ ہم ان کے پڑوس، مال روڈ نمبر ۵۔ اے سے اپنا اخبار "بادِ شمال" نکالتے تھے جو اگرچہ تھا تو روزانہ اخبار، مگر نکلتا ہفتے میں ایک بار تھا ڈاک خانے والوں نے دونوں طرف کے جعفریوں کو ایک رسّی میں باندھ رکھا تھا، ان کی ڈاک ہمارے ہاں اور ہماری ڈاک ان کے گھر، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں ان کا رسالہ "ہمایوں" لے کر گیا تو بدلے میں انہوں نے میرا رسالہ "ادبی دنیا" تھما دیا۔ مجھے نمبر ۵ مال روڈ کی ڈاک ہی سے معلوم ہوا کہ جس ادا جعفری کے نام پر ادبی رسالے چلے آرہے ہیں، یہ اردو کی وہی ممتاز شاعرہ ہیں جو ادا بدایونی کے نام سے لکھتی تھیں، مگر جب ان سے ملاقات ہوئی تو انکی "ترقی پسندی" پر حیرت ہوئی۔ بجائے خود "ترقی پسندی" حیرت کی بات نہیں خوشی کی بات تھی، مگر وہ اپنے سماجی پس منظر اور بظاہر اپنی طبیعت کے لحاظ سے بھی، کچھ ایسے ملائم سے، بلکہ کچھ کچھ خواب آور ماحول سے تعلق رکھتی تھیں کہ وہ اگر شاعری میں بہت دور بھی نکل جاتیں، تو بس یہی کہ ساحل سمندر پہ رنگین چھتری تان کر بیٹھ جاتیں، اور اپنے شعروں کے لیے "زمرد کے گلو بند" اور اپنے بچّوں کے لیے ریشمی فراک بنتی رہتیں۔ مجھے سب سے پہلے انہی کا گھر دیکھ کر شعوری طور پر یہ احساس ہوا کہ کسی ادیب کے ڈرائینگ روم سے اس کے فکری رجحانات کا اندازہ نہیں لگانا چاہیے۔ بعض اوقات فرش پر قالین اور دل میں بوریا بچھا ہوتا ہے ـــــ یا جیسا کہ پیر ہجویری حضرت داتا گنج بخش رحمہ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:۔

"صوفی اندر کی تجلی سے بنتا ہے، جسم کے اوپر پڑے ہوئے کمبل سے نہیں"۔

راولپنڈی اُن دنوں رقبے کے اعتبار سے چھوٹا، مگر "دل گردے" کے لحاظ سے "بڑا شہر" تھا۔ شہر بھر میں آٹھ دس موٹریں تھیں اور اتنے ہی شاعر تھے۔ موٹروں میں ایک کمانڈر انچیف کی تھی اور ادبی حلقوں میں پوٹھوار کے "بابائے اردو" حضرت

عبدالعزیز فطرت شعرا کے "کمانڈر انچیف" تھے۔ کہ ان کا گھر (سدا بہار) "کعبۂ سخنوراں" تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان دنوں کے پیدل لوگ آج کل کے موٹر سوار لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ ایک دوسرے سے میل جول رکھتے تھے، قیام پاکستان کے بعد جب شہر کی ادبی اور تہذیبی زندگی نئے سرے سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے لگی، تو ادب کے "پرائیویٹ سیکٹر" میں (سرکاری سکیٹر ان دنوں ہوتا ہی نہ تھا) ادب اور ادیبوں کے جو چھوٹے بڑے ہیڈکوارٹر اپنے اپنے آرٹ اور "آرکیٹیکچر" کے مطابق نمودار ہوئے، ان میں سول لائن پر جناب فضل احمد کریم فضلی کا کشمیر ہاؤس ٹرنک بازار میں فقیرِ گوشہ نشین نواب اشک رام پوری کا آستانہ، کمیٹی چوک میں ڈاکٹر گزن کا مطب، صدر میں عزیز ملک کا ادبی حجرہ شاہ مقیم" کالج روڈ پر علامہ جدت میرٹھی کا دبستانِ قدیم، گوالمنڈی میں پروفیسر رزمی صدیقی کا فن کدہ اور ۵۔ مال روڈ پر "آدادور" کا گھر، راولپنڈی کے چند قابلِ ذکر ادبی تکیے سمجھے جاتے تھے۔ ان کا ہیڈ کوارٹر ایک وسیع الظرف ہیڈ کوارٹر تھا، بلکہ نسیم الظفر مرحوم کی نسبت سے کہ یہاں کی بیٹھکوں کے رکن رکین تھے، اسے "نسیم الظرف" کہنا چاہیے، یہ واحد مقام تھا، جہاں ابوالاثر حفیظ جالندھری جگر مراد آبادی، کی غزلوں اور ن۔م۔ راشد اور یوسف ظفر کی آزاد نظموں کو یکساں فراخدلی کے ساتھ سنا جاتا اور ادب کے کتنے ہی مختلف نیستانوں کے دھاری دار شیر اور چیتے بارہا ایک گھاٹ پر چائے پیتے پائے جاتے سب سے بڑی خصوصیت اس گھر کی رچی ہوئی صادقانہ تہذیبی فضا تھی۔ جیسے وہاں سب لوگ نماز روزے کے علاوہ علم و ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ سے بھی گہری، صدیوں پرانی شیفتگی رکھتے ہوں۔ یہ نہیں کہ مثلاً جیسے ہمارے ڈاکٹر گزن کے ہیڈ کوارٹر میں بعض اوقات ہوتا تھا کہ شعرائے کرام مطلعے، مقطعے عرض کر رہے ہیں کہ اچانک اوپر سے ڈاکٹر گزن کے عمِ بزرگوار، بغل میں شطرنج دبائے، جنگِ عالمگیر اول کے دور ریٹائرڈ تمغے ابھی تک باغ و بہار حوالدار میجروں کو جلو میں لیے، دور سے دکھائی دیتے ہوئے آتے،

"اوئے! ایہہ کی کھپ پائی ہوئی اے تساں؟ نسو ایتھوں، مطلبیاں سمیت"
(تم لوگوں نے کیا اودھم مچا رکھا ہے؟ بھاگو اپنے مطلعوں سمیت)
اور پھر جس طرح ڈاکٹر صاحب کے مریض عموماً افاقہ ہونے کے بعد اچانک دم توڑ دیتے تھے، اسی طرح ان کے مشاعرے بھی پینگ کے سب سے اونچے "ہلارے" میں ٹوٹ جاتے۔

نور بھائی اور ادا بہن کے ہاں کی نشستوں میں ابتداءً کچھ کچھ یوں لگتا تھا جیسے یہ سب شاید الہ آباد کے مشہور سنگم پہ بچھی ہو، مگر رفتہ رفتہ، جوں جوں ان کو "رانجھے، رانجھن اور رانجھیلے" کا فرق سمجھ میں آتا گیا اور ان کے ڈرائینگ روم میں رانگلے، خوشابی بیر، بڑھے اور "لونکیاں" (نمکدان) جگہ پکڑنے لگیں، اس پر سواں کیمپ کا گمان ہونے لگا۔

شعر کے پرکھنے کا میرا "جنرک" نظریہ یہ ہے کہ شعر پڑھ کر دل میں اتنی تحریک پیدا ہو جتنی بچپن میں کوئی خوش رنگ، تتلی اور جوانی میں کوئی پیاری صورت دیکھ کر پیدا ہوتی ہے شعر کو سب سے پہلے شعر ہونا چاہیے۔ اس کے بعد جتنی چیزیں ہیں، وہ رئیسی کے ٹھاٹھ ہیں فراغت کی مینا کاری ہے، اسمبلی کی بحث ہے، آبِ دہواں ہے یارگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے کا ہنر۔ رجحانات کے بارے میں میرا ذاتی رجحان یہ ہے کہ آرٹ اور رجحان دونوں کی سلامتی اسی میں ہے کہ انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دیا جائے۔ فن زندگی ہے اور زندگی اپنا محور خود پیدا کر لیتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا اس شاہراہ پہ، مسجد و تالاب اور یوتھ ہوسٹلوں کے سائن بورڈ آویزاں کرنا ضروری ہیں نقد و نظر کی میزان ہم مغربی نقادوں سے بھی مانگ سکتے ہیں، بالخصوص انگریزی تنقید کے مولانا الطاف حسین حالی، یعنی میتھیو آرنلڈ صاحب کے تیر بہدف اقوال نقل کر دینا کیا مشکل تھا، لیکن ہم نے سوچا ادا جب پچھلے کئی برس سے پوٹھوار میں، رس بس رہی ہیں اور اس ناتے سے "پوٹھوارن" بن چکی ہیں تو ان کے فکر و فن کا جائزہ پوٹھوار ہی کے ایک بزرگ شاعر، پنجابی زبان کی غیر فانی مثنوی "سیف الملوک"

کے خالق، عارف کامل حضرت میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے کیوں نہ لیا جائے حضرت نے شعر کی تعریف اس طرح فرمائی ہے:۔

جس وچ گجھی رمز نہ ہووے، درد منداں دے حالوں
بہتر چپ محمد بخشا سخن ایجیہے نالوں

جس شعر میں دکھی انسانوں کے حوالے سے کوئی گہری رمز نہ ہو، ایسا شعر کہنے سے چپ بھلی)

قصّے ہور کسے دے اندر درد اپنے کجھ ہوون
بن پیڑاں تاثیراں ناہیں بن پیڑے کد روون

یعنی ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں)

باجھ اَدا رسیلی یارو لگدا شعر اَلونا۔
دُودھ اندر جاں کھنڈ رلایئے مٹھا ہوندا دونا

نغمگی کی لَے کے بغیر شعر بے نمک ہوگا۔ دُودھ میں شکر ملاتے سے لذت دوچند ہو جاتی ہے ـــ یعنی ـــ آتش گل پہ قند کا ہو قوام!)

توڑے کُتے بن کے رہیئے، وچ وطن دی گلیاں
دَر دَر جھڑکاں کھایئے بھاویں فر پردیسوں بھلیاں

اپنے وطن میں خواہ کتوں کی طرح "درکارے" جائیں، تب بھی وطن کی گلیاں پردیس کی جنت سے ہزار درجہ خوشتر ہیں۔

مصرعے اندر جڑیا ہووے جیوں تھیوا وچ چھاپے
جے کوئی ڈونگھی نظروں دیکھے، بیتوں بیت سہاپے

(الفاظ مصرعوں کے اندر اس طرح جڑے ہوں جیسے انگوٹھی میں نگینے۔ شعر پر جتنا غور کرد

اتنے ہی پرت مضمرات کے کھلتے چلے جائیں۔)

میاں صاحب نے دوسروں کے درد کی صراحت کر کے معاشرے کی تمام خوبیوں اور خرابیوں کو موضوعِ شعر قرار دے دیا۔ مقصود یہ کہ شعر کی بنیاد حقیقت پر ہو، یہ نہیں کہ سے

کوئی سوتا ہو جیسے ڈوبتی کشتی کے تختے پر

ان کے نزدیک فکر کے بغیر شعر کا "اُلارا" فرضی معاملہ بندیوں تک محدود رہتا ہے۔ نغمگی سے ان کی مراد شیرینی و توازن کے اُس حُسن سے ہے جو اگر شعر میں موجود نہ ہو تو قاری زیادہ علم کے بجائے، تھوڑے سے ادب کی دعائیں مانگنے لگتا ہے۔ الغرض، میاں صاحب کا مطالبہ شعر سے یہ ہے کہ وہ دل اور دماغ دونوں سے خراج وصول کرے۔

گر یہ نہیں تو بابا ساری کہانیاں ہیں

اب آیئے، ایک دریچہ کھول کر، کچھ نظارہ ان کے شعری گل بوٹوں کا بھی کر لیا جائے۔ شاعر اپنے خوابوں کا باغ ہی تو لگاتا ہے۔

راستے میں کچھ ساتھی رہ بدل بھی جاتے ہیں
پھر کبھی نہ ملنے کو کچھ بچھڑ بھی جاتے ہیں
خشک ہو چکے گجرے کس گلے میں ڈالو گی!
بھولی بھٹکی خوشبو کس کا راہ روکو گی!
کس نے اشک پونچھے ہیں کس نے ہاتھ تھاما ہے؟

جس کسی لفظ میں پائی ہے صداقت کی مہک
میں نے اس لفظ کے قدموں میں جبیں رکھ دی ہے

ہاتھ کانٹوں سے کر لئے زخمی پھول بالوں میں اک سجانے کو

میں تمہیں نہ بھولوں گی　　　میں کہ فطرتاً ماں ہوں

میں تو خود کوزہ گر و خالق و صنّاع بنی　　　شہر بانو بھی مرا نام رہا، مریم بھی

میری آغوش میں یہ ہمکتا ہوا چاند فردا کے خوابوں کی تعبیر ہے
یہ نئی نسل کے حوصلوں کا امیں، آنے والے زمانے کی تقدیر ہے

ان رہوں میں تھے، ویت نام و کشمیر بھی
ایسے قریے بھی تھے جن کو تاریخ بھی
نام اب تک نہیں دے سکی!

چاک گریباں والے لوگو، تم کیسے گُن والے ہو
آنکھیں کرنیں، ملتھے سورج اور کٹیا اندھیاری
شیشہ سچّا اجلا جب تک، اونچا اس کا بھاؤ

نازِ وفا کا بت بھی ہمیں توڑنا پڑا　　　لوگو، شکستِ دل سے بڑا سانحہ ہوا

یہ برگِ گُل سی تمنا، یہ ریگزار سی دھوپ　　　یہ خوش خرام کھُلے سر کہاں چلی آئی

کس نے برتا ہے رنگِ لالہ و گُل　　　یہ قبا کس بدن کو راس آئی

اِک کرن تبسّم کی زادِ راہ بن جاتی — اور دل نے کیا مانگا، اور ہم نے کیا چاہا

یہ مرے عہد کی یا خود مری کہانی تھی — جو دسترس سے ہو باہر، اُسے خدا کہنا

یہ شوخ لال اوڑھنی
جو ممتا کی چھاؤں میں
گلاب سے الجھ گئی

وہم پوجا ہے، گمانوں کی عبادت کی ہے — اپنے مرقد پہ نہیں، گھر پہ دیے بھی جلتے

دِل کو شیشہ کہنے والو — کس دنیا میں رہتے ہو
دِل کی زد پہ آنے والی — بپھری موجیں، مرجاتی ہیں
یہ وہ بھٹی انگاروں کی — جس میں لوہا گل جاتا ہے

آگے حریمِ غم کے کوئی راستہ نہ تھا — اچھا ہوا کہ ساتھ کسی کو لیا نہ تھا
کچھ اتنی روشنی میں تھے، چہروں کے آئنے — دِل اس کو ڈھونڈتا تھا جسے جانتا نہ تھا
کیا بوجھ تھا کہ جس کو اٹھائے ہوئے تھے لوگ — مُڑ کر، کسی کی سمت کوئی دیکھتا نہ تھا

قافلے لٹتے ہی رہتے ہیں گزرگاہوں میں — لُوٹنے والوں نے کیا عزمِ سفر بھی لُوٹا؟
دجلۂ خوں تو نئی بات نہیں ہے لیکن — وہ جو ڈوبا ہے، سفینہ ہے کہ ساحل ڈوبا؟

تُو کہ ہے شناورِ تشنہ لب　　جو وقارِ حرمتِ دوستاں
وہی حرفِ مہمل و بے زباں　　تری تشنگی نہ مٹا سکا
کوئی جامِ جم، کوئی بادیہ!

دیکھو تو ہر جبیں پہ ہے اک آشنا سی لَو　　سوچو تو آس پاس کوئی رازداں نہ تھا

ہر لمحہ اک صدی سا گزارا ہے کرب سے　　دل کو ندامتِ نفسِ رائیگاں نہیں

(”شہرِ درد“ اور ”غزالاں تم تو واقف ہو“ میں سے)

مجھ کو قالینِ پارے بچھانے کی تو مقدرت ہی نہ تھی
راستے میں مگر جتنے کانٹے ملے
ان کو اپنے دل و جاں میں پیوست کرتی گئی
ہاں مبادا گزند اِن سے پہنچے تمھیں

ٹھہر دل، تو چٹانوں سی کلیجے پہ کھڑی ہے　　جاؤں تو مرے ساتھ ہی دیوار چلے ہے

ان کو صدیوں کی چالوں سے کیا واسطہ
وہ جو لمحوں کی انگلی پکڑ کر چلے
وقت نے ٹھہر کر ان کو تعظیم دی
اور وہ دل جلے سر پھرے
آگے بڑھتے گئے
بار ہا راہ میں

جو تھکے بھی نہ تھے ، ہم سفر ہو گئے
اور اُجاگر مگر راستے ہو گئے

زندگی کی رگوں کو لہو بخش کر
اہلِ دل فرض اپنا ادا کر گئے

آج اس سانس سے بارود کی بُو آتی ہے
میں نے جس سانس کو سمجھا تھا دمِ عیسٰے ہے

یہی آئینِ وفا ہے اب کے　　دِل دھڑکنا بھی سزا ہے اب کے

ہر نفس کتنی تمنائیں ہیں دامن تھامے　　کتنے حلقے ہیں سرِ حلقۂ زنجیر کہو ؟

صبحِ زنداں میں بھی ہوتی ہوگی　　پھول مقتل میں بھی کھلتے ہوں گے

راہوں میں کوئی آبلہ پا اَب نہیں ملتا　　رستے میں مگر قافلہ سالار بہت ہیں

ٹوٹی مالا کوئی سمیٹے　　بکھرے سپنے جیون بھر کے

آپ نے دیکھا کہ اداؔ کی شاعری مسلسل ایک محور پہ چل رہی ہے ۔ یہ انسانوں کی چاہتوں اور محرومیوں کا محور ہے ۔ یہ زندگی کے راستے پر گرتے پڑتے ، غلطیاں کرتے ، ناکامیوں سے دو چار ہوتے ، انجانی منزلوں کی طرف بڑھتے چلے جانے کا عمل ہے ۔ "جو ہی کلیوں" سے لے کر "مسجدِ اقصٰے" تک زندگی کے بے شمار رُوپ اور تجربے اداؔ کا موضوعِ شعر بنے !

وہ انسان کو فطرت کا سوتیلا بچہ نہیں سمجھتیں۔ وہ جتنی ذمہ داری خود اپنے گھر کے لیے محسوس کرتی ہیں، اتنی ہی ذمے داری اسلام آباد کے سیکٹر شالامار نمبر ۶ کے لیے جس میں ان کا مکان واقع ہے، بلکہ پورے شہر، سارے ملک، تمام دنیا کے لیے محسوس کرتی ہیں۔ جس میں وہ سانس لے رہی ہیں۔ وہ اس پورے عہد کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتی ہیں جس کی کہانی وہ لکھ رہی ہیں۔ اسلام آباد کا نقشہ اگر "شہرِ درد" کے خمیر سے اٹھایا جاتا، تو مجھے یقین ہے کہ اسلام آباد کے کسی بنگلے میں کوئی "سرونٹ کوارٹر" نہ ہوتا۔ سخاوت کی طرح فرض کی ترشول بھی اپنے گھر کی دہلیز ہی سے پھوٹتی ہے۔

ادب کی قدیم حویلی میں اداؔ کی "بے در و دیوار سی بغاوت" بھی اگرچہ گیارہ گولوں کی سلامی کی مستحق ہے، مگر میرے خیال میں ان کی انفرادیت ان کی بغاوت میں نہیں، ان کے لہجے کی حلاوت میں ہے۔ بغاوت کی "دھوپ" ان سے پہلے بھی شاعری کے صحن میں اتر چکی تھی۔ مگر چاندنی کی جن لکیروں میں اداؔ نے حدیثِ دل زدگاں رقم کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ انہوں نے ہماری اونچی اور گہری فکری شاعری کو، پہلی مرتبہ وہ لہجہ دیا ہے جس میں عورت کا دل دھڑکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس لہجے نے عورتوں کی سُنت کا لباس پہن رکھا ہے۔ اس کے پیرہن اور روح سے عورت کے جسم و روح کی خوشبو آتی ہے۔ شاعر صرف حسن دیکھتا ہی نہیں حُسن تخلیق بھی کرتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اداؔ کا آدرش حسن و مسرت کی تلاش ہے اور ان کو یہ نکتہ خوب معلوم ہے کہ حُسن، صداقت کا اور مسرت، عدل کا دوسرا نام ہے۔ اداؔ کا شعر، کشیدگیوں، تصادموں اور ناہمواریوں سے کٹی پھٹی انسانی زندگی میں سکندرِ اعظم کی شہزادگی کے زمانے کا ارسطو معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ شائستگی کا پرچار نہ کرتا تو سکندرِ اعظم کے ہاتھوں اس کا باپ یا باپ کے ہاتھوں سکندرِ اعظم مارا جاتا

اب تو خیر ادبستان کے بہت سے طوطوں اور طوطیوں نے یہ طرزِ نو اختیار کر لی ہے مگر جس وقت اداؔ نے لکھنا شروع کیا تھا، تو یہ اسلوب سورج کی طرح افق پر تنہا طلوع

ہوا تھا، یہ دھیما دھیما سا، سرگوشیاں کرتا، گیلی لکڑی کی طرح سلگتا ہوا، ایک عجیب چاک گریباں سا لہجہ ہے جس میں کوئی لفظ اونچی ایڑی کی گرگابی پہن کر نہیں چلتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری، اپنے اصل قد سے زیادہ قد آور معلوم نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک اس لہجے کی سب سے دلآویز خصوصیت اس کی وہ تہذیبی ایکتا اور اپنائیت ہے جس کے لمس سے خیال اور جذبے کے ساتھ ہمارے دیس کے دریا، پہاڑ، کھیت، گاؤں اور شہر، پریم اور پیراہن بھی چمک اٹھتے ہیں، یہ اسلوب، شیرِ مادر کی طرح اتنا سچا اور قدرتی ہے کہ ان کی نظم کو نثر میں ڈھالتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ مصرعوں میں کہیں سلوٹیں نہ پڑ جائیں۔ ایک نظم "میراثِ آدم" سے ایک اقتباس دیکھیے:

اک کلی کے لیے
اک کرن کے لیے
زہر پیتے رہے
جی گنواتے رہے
غم رسیدہ نہ ہو
دل گرفتہ نہ ہو
آج کی موت بس
آج کی موت ہے

یہ اس اسلوب کا فیضان ہے۔ کہ آرٹ ان کے شعر کا گہرائی میں بھی ہوتا ہے، استعارے میں بھی اور سطح پر بھی جیسے ان کے ہاتھ کے پکے ہوئے سالن کی پور پور میں مسالہ رچا ہوتا ہے ان کا آرٹ جہاں سطح پہ ہوتا ہے وہاں کسی بنک کے "گن مین" کی طرح مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا، دور ہی سے ٹہلتا دکھائی نہیں دیتا نہ گلی محلے کی روایتی "ماسی مہراں" اور "چاچی تاجاں" کی مانند اپنی اپنی "ڈروٹیوں" پہ آمنے سامنے بیٹھ کر چیختا چنگھاڑتا ہے۔ یہ ندی اپنی دھن کی نغمگی میں مست بہتی ہے۔ یہ اسی اسلوب کا کرشمہ ہے کہ اونچے آسمانوں کی تیز ہواؤں میں اڑتے

ہوئے بھی اداؔ کے شعر کے پَر ٹوٹنے نہیں پاتے اور یہ غالباً اداؔ کے خاندانی سگھڑاپے کا اثر ہے کہ وہ اپنے اسلوبِ شعری میں بھی (IMPRESSIVE) تو ہیں مگر (EXPENSIVE) نہیں ہیں۔ وہ انقلاب کی داعی ہیں، مگر وہ انقلاب کا کیلنڈر نہیں لکھتیں۔ وہ اپنے عہد کی کہانی بے شک لکھ رہی ہیں، مگر ان کی شاعری میں کوئی گھڑی ٹِک ٹِک کرتی سنائی نہیں دیتی۔ انقلاب کی آبرو کو سلامت رکھنا انقلاب برپا کرنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے، مدتوں پہلے اداؔ کی ایک پیش رو، فارسی کی علیم اللسان شاعرہ زیب النساء مخفی نے کہا تھا ؎ : خندہ برلب دیدہ خونبار بودن مشکل است۔

" اداؔ اپنے مقدور کے مطابق یہی مشکل کام سرانجام دے رہی ہیں۔

اداؔ کی ایک نظم کا عنوان ہے: "روپ کے رنگ ہزار" اس طرح محبت کے بھی ہزار روپ ہیں۔ ایک شاعری ہی کیا، محبت کا جذبہ، جملہ فنونِ لطیفہ میں، بادِ سحرگاہی کے نم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اداؔ کی شاعری میں یوں تو اس جذبے کے اکثر رنگوں کی گوہر افشانی ملتی ہے، مگر سب سے گمبھیر، محبت کے اس برتر جذبے کی صورت میں اُبھرتا ہے جس سے آدمی کے دل سے موت کا خوف کم ہو جاتا ہے، جیسے ماں کی محبت، وطن کی محبت، انسانوں کے دکھ درد میں اشتراک۔ ایک نظم میں انہوں نے محبت کے مختلف رنگوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا ہے:

محبت ایک راز ہے — محبت ایک ناز ہے
محبت ایک خواب ہے — محبت اک گناہ ہے
محبت اک نگاہ ہے

کسی جگہ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میرا مذہب محبت اور امید ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک خاص زاویے سے جذبے کا اظہار، فانوس کی روشنی کی طرح جھلملاتا ہے، جنگل کی آگ کی طرح بھڑکا ہوا نہیں ہے اور نہ عورتیں اور مردانگی شاعری میں درختوں سے گرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُردو اور فارسی کے مردِ شعرا نے محبت کے موضوع سے جس "سکیل" پر ہاکی کے سٹک ورک (STICKWORK) کا مظاہرہ کیا ہے، میرے خیال میں کسی خاتون سے اس کی

توقع نہ رکھنی چاہیے کہ آخر وہ ماں ہے، بیوی ہے، بہن ہے، بہو اور بیٹی ہے۔ ادا نے یقیناً ایک فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کی ہے مگر وہ تہذیب دین کی روحانی اور اخلاقی قدروں کی تقدیس میں بھی اعتقاد رکھتی ہیں جن میں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک قول کے مطابق ایک قدر یہ بھی شامل ہے کہ "انسانیت کی آبرو، تخت و تاج سے نہیں، فقر و حیا سے ہے۔"

ادا کے تینوں مجموعے ملا کر پڑھنے پر مجھے تو ایسا لگا کہ وہ اردو میں "سیف الملوک" لکھ رہی ہیں مٹھاس، دردمندی، ظلم و جبر کے خلاف جہاد، تفکر اور رسیلی ادا کی وہی موج جو وہاں یم بہ یم ہے، یہاں جو بہ جو دکھائی دیتی ہے۔ ممتاز فلسفی والٹیئر کے آخری الفاظ کتابوں میں محفوظ ہیں، یہ اس نے اپنے دوست بنجمن فرینکلن کے بیٹے سے کہے تھے۔ یہ دو لفظ تھے۔ میرے نزدیک یہ دو لفظ "سیف الملوک" کے ابیات کا محور بھی ہیں اور ادا کی شاعری کا محور بھی اور یہ دو لفظ ہیں:

"خدا اور آزادی"

(یہ مضمون مئی ۱۹۷۵ء میں لکھا گیا)

عدَم کا وجُود

عدم کے نئے مجموعے "آبِ زر" میں ایک شعر ہے۔

قتل کرنے سے پہلے لوگ عدم
خواہشوں کو جوان کرتے ہیں

لیکن جہاں تک عدم کے اپنے تیوروں کا معاملہ ہے، ان کی خواہشات ہمیشہ جوان بلکہ کمسن رہیں گی۔ ان کی خواہشوں کے بعض غنچے بن کھلے مرجھا سکتے ہیں، لیکن پھول بننے کے بعد ان پر خزاں نہیں آسکتی۔ یہ خود بوڑھے ہو سکتے ہیں، مگر ان خواہشوں کی سینڈور کبھی مدھم نہ ہو گی۔ زندگی کا جو راستہ عدم نے اختیار کیا ہے اس میں آدمی خود بڑھاپے کی طرف مگر خواہشات جوانی کی طرف رواں رہتی ہیں۔ آرزوں کا یہی الھڑپن، زندگی کا یہی کبھی نہ بجھنے والا شعلہ ہے جس نے ان کی شاعری کو، ادب کے وسیع سمندر میں، روشنی کا مینار بنا دیا ہے۔ میں نے یہ تذکرہ اس لیے بھی کیا ہے کہ عدم سے جب میں پہلی مرتبہ ملا تھا تو آپ اپنی خواہشات کی "پنیری" کو جوان کر رہے تھے، بلکہ اپنی طبعی عجلت پسندی کے باعث بعض خواہشات کو وقت سے پہلے جوانی بخش رہے تھے۔ خواہشات بھی ایسے خوابوں اور رنگوں سے نکلی اور خوشبوؤں میں لپٹی ہوئیں اور ان کے اوپر طرح طرح کی شرابیں بکھری ہوئیں کہ ان کی خواہشات کو دیکھ کر ———— دوسروں کا دم نکل جاتا تھا۔

عدم ان دنوں ابھی ایک پرت کے کھڈ بدے سے نوجوان تھے اور ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کی ملازمت کے سر رشتے سے ہمارے شہر جہلم متعینہ تھے۔ آج ان کی ادبی شہرت میں گہرائی اور اونچائی بے شک زیادہ ہو گی۔ لیکن لمبائی اور چوڑائی اس وقت بھی کچھ کم نہ تھی۔ جوش

اور عدم کے درمیان اگرچہ ایک پوری نسل کا فاصلہ حائل تھا، لیکن عمروں کی فراواں تفاوت کے باوجود صورت حال کچھ ایسی تھی کہ

جوش یوپی میں غزلخواں تھا۔ عدم پنجاب میں

پنجاب میں حفیظ اور اختر شیرانی کے بعد جن شاعروں کی دھوم ہم نے اپنی آنکھوں سے مچتی ہوئی دیکھی۔ ان میں عدم بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ نوجوان عبدالحمید عدم نے ابتدا ہی کچھ ایسی گلفام و گلبدن نظموں سے کی تھی۔ کہ ہر نظم میں اردو شاعری کی ایک نئی صبح طلوع ہوتی دکھائی دیتی۔ ان کے اولیں مجموعے "نقش دوام" کو جو دلوں میں سما جانے والی قبولیت حاصل ہوئی وہ کسی نوجوان شاعر کو شاذ و نادر ہی نصیب ہوئی۔ اُن کے طبع شدہ شعری مجموعوں کی "مردم شماری" کا حساب مجھے یاد نہیں لیکن اتنی بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ "نقش دوام" کی آب و تاب (ممکن ہے آب و تاب ان کے کسی مجموعے ہی کا نام ہو؟) آج تک مدھم نہیں ہو سکی۔ اس کی بانکی، ادبی، اُجلی، ملائم اور ریشمی نظموں کے پاس میں جرات مندانہ فکر کی ایک گمبھیر جوالا۔ "بستان چراغاں، دیوالی فرد زاں" نظر آتی تھی، اس کی چمک اور چبھن رنگ اور آہنگ پر پوری شاعری چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگ گئی تھی کہ یہ کون

یہاں بھی منہ اندھیرے آ گیا ہے

عدم کے بزرگوں نے غالباً بر بنائے دور اندیشی ان کی شادی نوعمری ہی میں ایک نیک بخت، صابرہ اور سگھڑ قسم کی بنت حوا سے کر دی تھی۔ کچھ ٹھیک سے اب یاد نہیں رہا لیکن جہلم میں آپ تین چار بچوں کے باپ بن کر وارد ہوئے تھے۔ جن کو آپ لاڈ سے گھوڑا، شیر، چیتا وغیرہ کے ناموں سے پکارتے تھے۔ گھوڑا، ان سب میں بڑا تھا، بازار سے سگریٹ پان لانے کے لیے دوڑنے بھاگنے کا کام گھوڑے ہی کے سپرد تھا۔ (یہ گھوڑے، شیر اور چیتے خدا کے فضل سے اب نہایت اونچے اور اہم منصبوں پر فائز ہیں)۔

معروف افسانہ نگار اور فلم ساز حفیظ رحمانی ان دنوں وہیں نہر کے محکمے میں ملازم

ے۔ مہر عموماً بند رہتی تھی۔ البتہ رومانی چلتے رہتے تھے۔ عدم تک میں انہی کے واسطے
ے پہنچا۔ ان دنوں، عدم کے بیوی، بچے راولپنڈی میں تھے، اور وہ خود نئے محلے کے ایک
انے دو منزلہ مکان میں تین چار ہم عمر اور ہم مذاق احباب کے ساتھ گویا ایک چھوٹے
ے ہوسٹل میں بود و باش رکھتے تھے۔ یہ سب نوجوان اس دور کے اکثر تعلیم یافتہ مسلمانوں
طرح، مختلف سرکاری دفتروں میں چھوٹی چھوٹی اسامیوں میں بندھے ہوئے تھے۔ اپنی
ھی سے زیادہ تنخواہ اگرچہ پیچھے بیوی، بچوں کو بھیج دیتے تھے، تاہم زندہ دلی اور بے فکری
اعتبار سے اُن کے کنوارپن کا کانچ ابھی ٹوٹنے نہ پایا تھا۔ پاکستان میں یہ سب اصحاب
ے اونچے اونچے عہدوں تک پہنچے۔ اس وقت ان لوگوں کے اشغال و اعمال سے اتنی
ضرور بندھی تھی کہ اگر خدا نخواستہ ملازمت کبھی جاتی رہی تو گا بجا کر روزی کما لیں گے۔
م نامور شاعر تھے، ملک صاحب پکی گائیکی میں ایسی زبردست دستگاہ (دست گاہ اس لیے
گاتے وقت وہ ہونٹوں سے زیادہ ہاتھ ہلاتے تھے) رکھتے تھے کہ ان کو بڑودہ یا پٹیالے
واقع ہونا چاہیے تھا۔ چودھری صاحب طبلے کے رستم اور شیخ صاحب سارنگی دستار
پر ور دگار تھے۔ اپنے مکینوں کی طبیعت و سرشت کے لحاظ سے یہ ہوسٹل "بی۔ ایچ۔ کیو
(BACHELOR HEAD QUARTE کہلاتا تھا۔ عدم ان کے "شاہ بادشاہ" تھے۔

"شاہ بادشاہ" دن کو دفتر کی چکی پیستے، البتہ شام کو ان کی سلطانی کا دور دورہ شروع
اجس کو "فرخندہ شبی" کے شاعرانہ نام سے یاد کیا جاتا۔ یہ دور بسا اوقات اگلی صبح تک
ی رہتا" بی۔ ایچ۔ کیو میں دو وقت کی روٹی کی طرح، عدم کم از کم دو غزلیں (یا نظمیں)
یا ہر روز کہہ لیا کرتے تھے۔ رات کو سوچی ہوئی غزل ناشتے پر اور دفتر میں اتری ہوئی
، سہ پہر کی چائے پر۔ احباب کو سنائی جاتی" بی۔ ایچ۔ کیو" کے باسی نہ باسی طعام کھاتے
ی کلام سنتے۔

چائے کے بعد ساز و آواز کی سبھا جم جاتی۔ اب عدم کی غزلیں ہارمونیم، ستارہ سارنگی

اور طبلے کی سنگت میں باقاعدہ گائیکی میں ڈھال کر گائی جاتیں۔

رُدح پرور نام اور القاب یاد آنے لگے
چاند یاد آنے لگے، مہتاب یاد آنے لگے

اور

وہ رکھ رہے ہیں پاؤں حدودِ شباب میں
محشر کی پَو پھٹی ہے، خدا کے حساب میں

اور

چاہا ہے جبکہ تیری وفا کا ثبوت دوں
اپنے خلوص کو بھی دیا کہہ گیا ہوں میں

اور

جو ناداں تھے وہ پھول اب تک ہیں تازہ
جو دور اندیش تھے مُرجھا گئے ہیں

اور پھر جب حمید ملک لمبی بحر کی کسی غزل کو پکڑ کر قوالی کی دھن میں دھننے لگتا: مثلاً

وُہ سامنے جب آجاتے ہیں یکلخت یہ کیا ہو جاتا ہے
میں دِل سے جُدا ہو جاتا ہوں دل مجھ سے جدا ہو جاتا ہے

تو پھر رقص بلند آہنگ کی وہ خاص دھما چوکڑی بپا ہو جاتی ع
جسے اربابِ دانش لغزشِ مستانہ کہتے ہیں

مندرجہ بالا اشعار "آبِ زر" میں سے نقل کیے گئے ہیں۔ لیکن عدم کا شعر ابتدا سے ہی تقریباً اسی سطح و مزاج کا "حرفِ طبیعت زاد" رہا ہے ان کو پیدائشی قادر الکلام شاعر کہنا چاہیے۔ شراب و شباب کے امتزاج سے جو نظامِ فکر وہ اپنے شعر میں کشید کرتا ہے، جس "سلیس آنکھ" سے زندگی کے افکار و حوادث کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور جس

دلیرانہ بلکہ جارحانہ پیش دستی سے حقائق کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھاتا ہے۔ یہ تمام عوامل، ایک واضح جذبے، ایک مخصوص تجربے، ایک لازوال آرزو، اور ایک مسلسل ذہنی پس منظر کی صورت میں، عدم کی ابتدائی شاعری میں نفاست و صداقت کے ساتھ، کارفرما دکھائی دیتے ہیں ــــ بہر حال ابھی طبلے کی گونج تھمنے نہ پاتی تھی کہ اہلِ محفل میں سے کوئی صاحب گھن گرج کے تحت اللفظ میں عدم کا یہ شعر پڑھ کر "فرخندہ شی" کا گجر بجا دیتے کہ ؎

لرزتے آنچلوں کے گفتگو کرنے کی رُت جاگی
دھڑکتی چھاتیوں کے شعر خواں ہونے کا وقت آیا

اور قافلۂ احباب، سارنگیوں کو طے کر، شہر کے بازاروں میں گھومتا ہوا دریا کے کنارے جا نکلتا جہاں دریا کے اندر جیل، دیودار کی موٹی موٹی "گیلیوں" کے بندھے اور تیرتے ہوئے تختوں پر بیٹھ کر نئے سرے سے محفل شعر و سخن جم جاتی جس میں دل کی واردات اردو اور فارسی سے گزر کر پنجابی ابیات، ٹپوں اور بولیوں میں ادا ہونے لگ جاتی۔ گویا ؎

جسے جو کچھ بھی آتا جا رہا ہے یاد کہنے دو
بقدرِ ظرف سب کو عشق کی روداد کہنے دو

عدم کو باقاعدہ فکرِ سخن کرتے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن اس کیفیت میں بھی کبھی نہیں دیکھا کہ وہ فکرِ سخن میں مصروف نہ ہوں۔ شعر کہنے کے لیے ان کو کسی خاص ماحول یا فضا کی ضرورت نہ تھی ایسا لگتا تھا شعر ان کے اندر انگوروں، آموں، ناشپاتیوں کی طرح پکتے رہتے تھے اور وہ توڑ توڑ کر، مضامین تازہ کے انبار باہر لگاتے چلے جاتے۔ وہ ان شعرا میں نہیں، جو مناظرِ قدرت پر کہنے کے لیے پہروں اور دنوں جھیل وُلر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے رہیں یا ــــ سامنے تاج محل ہو تو غزل ہوتی ہے۔!

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ عدم "بی ایچ کیو" کے بے تاج بادشاہ تھے۔ احباب، جس ذوق و شوق سے ان کی ناز برداری کرتے اس کو دیکھ کر گمان ہوتا کہ ان لوگوں کو ہوٹل

کا باورچی خانہ چلانے یا عدم کا کلام سُننے اور گانے کے سوا دنیا کے کسی کام میں کوئی دلچسپ
نہ تھی۔ سچ یہ ہے کہ ان کے خلوص و محبت کی ادا دیکھ کر انسان کا شرفِ سعادت پر
ایمان تازہ ہو جاتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ مکتبہ التحریر کے نوجوان مالک جناب خالد
سیف اللہ ۱۹۴۴ء میں کس عالم میں تھے لیکن جس ذوق و شوق، لگن، چاؤ اور لگاوٹ
چمکا لشکا کر انہوں نے "آبِ زر" شائع کی ہے اس کو دیکھ کر خیال کرتا ہوں کہ اگر خالد صاحب
اس وقت جہلم میں ملازم ہوتے تو یقیناً بی ایچ کیو کے "گروہ وفا مستاں" میں شامل ہوتے۔

اپنی ذات اور اپنے گرد و پیش سے عدم کا سلوک یک گونہ بیخودی کا سلوک تھا۔ تہی
کیسہ و خورسند گرفتار مگر آزاد۔ سفینۂ غزل اور صراحیٔ مئے ناب کے علاوہ کسی شغل و شوق
عدم نے کم ہی کبھی شرفِ باریابی عطا کیا ہوگا۔ البتہ سگرٹوں میں تصرف سے زیادہ تنخواہ پھونک
دیتے تھے۔ خوش خوری کی خواہش ضرور تھی۔ لیکن اگر کوئی دوسرا پکا پروس کر سامنے رکھ
دے۔ سنا ہے، ایک زمانے میں "پنڈی اسپورٹس کلب" میں کرکٹ کے اسٹار کھلاڑی مانے
جاتے تھے۔ ان کا یہ شعر اسی شوق کی عکاسی کرتا ہے ؎

ہمارا بیٹ گزارہ تو کر ہی لیتا ہے
بقا، حبیب، امرناتھ یا نثار آئے

"بی ایچ کیو" میں ان کا یہ شوق گو ابھی مرنے تو نہیں پایا تھا۔ مگر زندہ بھی نہیں تھا
رغبت کی چنگاری جاگتی تو ان کا جی چاہتا کہ پہلے تو کوئی شخص آکر ان کو کرکٹ کی کٹ
(KIT) میں داخل کر جائے پھر کرکٹ کی تعریف میں ایک آدھ غزل ترنم کے ساتھ سنے
اور پھر آگے میدانِ عمل میں بھی "رننگ کومنٹری" (RUNNING COMMENTARY) کے ذریعے
ہوشیار خبردار کرتا رہے کہ حضور اِدھر دیکھیے!۔ حضور اُدھر دیکھیے۔

حضور آہستہ آہستہ، جناب آہستہ آہستہ

البتہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں شاعری کے ساتھ چوبیس گھنٹے کی لو لگی رہتی تھی

نے پورے عدم کو کسی بیرونی کام کی طرف، صدقِ دل سے، کاملاً متوجہ نہیں دیکھا۔ آدھا عدم آپ سے باتیں کر رہا ہے اور آدھا کسی غزل کے لیے نئی زمین کی تلاش میں خدا معلوم کہاں غائب ہے۔ شیو بناتے ہوئے ایک ہاتھ سے چہرے پر صابن بچھ رہا ہے، لیکن دوسرے ہاتھ سے اپنے اندر کسی تازہ شعر پر اُسترا پھیر رہے ہیں ؎

ہماری بہتری کی بات اکثر
ہمارے فہم سے باہر رہی ہے

بعض باتوں میں ان کی مستعدی پر حیرت ہوتی تھی۔ ان میں ایک دفتر کی حاضری تھی۔ دفتر کے وقت گھر سے یوں نکل جاتے، جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے پھر رسائل و جرائد کے ایڈیٹروں سے خط و کتابت کا شعبہ تھا جو "ایڈیٹر نگار" علامہ نیاز فتح پوری سے لے کر منشی خادم حسین حیدری ایڈیٹر "نئی زندگی" تک سینکڑوں ایڈیٹروں تک پھیلا ہوا تھا خطوط کے جواب لکھنے میں اگر آپ ہمہ تن مستعد نہ ہوتے تو اپنی ڈاک میں دب کر رہ جاتے "پی ایچ کیو" کے "امیر البحر" جو مقامی واٹر ورکس میں چھوٹے انجنیئر تھے عدم کی خط و کتابت کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اتنی ڈاک اگر کسی یونانی دواخانے کو نصیب ہو جائے تو طبِ یونان کا نصیبہ جاگ اُٹھے۔ دوستوں سے اخلاص و مروت کے باب میں ان سے تساہل تو ہو سکتا ہے۔ لیکن تغافل کو عمداً وہ روا نہیں رکھتے۔ وہ چیز جس کو ان کی زندگی کی روشِ خاص کہنا چاہیے دوستی اور دوستداری کے جذبوں سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اگر اس وقت آپ ساٹھ برس کے ہو چکے ہیں تو میرا قیاس ہے کہ ان میں سے کم از کم پچاس برس دوستوں کے جھرمٹوں میں گزرے ہیں۔ برس بھی ایسے کہ ؏

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

کچھ عرصے کے بعد، بھابی راولپنڈی سے گھوڑے اور شیر وغیرہ کو لے کر جہلم پہنچ گئیں تو عدم صاحب علیحدہ مکان میں اٹھ گئے۔ خیال ہوا کہ اب شاید ان کی روانی

میں کچھ لکنت پیدا ہو جائے لیکن ان کے شاعرانہ انہماک اور گم شدگی کی بالکل وہی صورت رہی جو پہلے تھی ان کا ایک شعر ہے ؎

ہم کو رغبت ہی نہیں خلق فریبی سے عدمؔ
ورنہ ہم صاحبِ اسرار بھی ہو سکتے ہیں

"خلق فریبی" کے علاوہ بھی سینکڑوں باتیں ہیں جن سے آپ کوئی رغبت نہیں رکھتے ان میں ایک چیز گھر داری ہے اہل و عیال سے ان کی محبت کی شدت و رقت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ حجام سے اپنے سامنے گھوڑے کی "نعل بندی" یعنی اس کے ناخن نہیں ترشوا سکتے تھے لیکن گھر کا ـــــ کارخانہ چلانے کے واسطے لون تیل لکڑی کے کھڑاگ سے ان کو سخت وحشت تھی۔ وہ اپنے گھر کو مسرور، پُر اطمینان اور فراغت سے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر بس ایسے ہی جیسے ان کے شعر آپ ہی آپ پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔ غالب کو دشت دیکھ کر گھر اور عدمؔ کو گھر دیکھ کر دشت یاد آتا تھا ؎

بعض راتوں کو عدمؔ ہوتا ہے محسوس مجھے
اتنا مشکل بھی نہیں گھر کا بیاباں ہونا

بہر کیف، امورِ خانہ داری میں خوش دلی سے ان کی شرکت کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو یہ گمان ہوتا کہ عدمؔ صاحب کسی دوسرے کے گھر میں رہ رہے ہیں۔ تعاون کے بھرپور موڈ (MOOD) میں بھی زیادہ سے زیادہ یہ کیفیت ہوتی تھی کہ ؎

نہ الجھا رہے ہیں نہ سلجھا رہے ہیں۔

ان معاملات میں عدمؔ کی عدم دلچسپی باخود فراموش کاری کا ایک واقعہ بھی سُن لیجیے، بازار میں "فرخندہ شبی" کی ابتدائی چہل قدمی ہو رہی تھی کہ یکبارگی آپ نے نعرہ لگایا ـــــ "حضور! کبابوں کی دعوت آج اس فقیر کی طرف سے قبول ہو" لیکن کباب کھلانے اور گشت شبینہ بھگتانے کے بعد، رات کے دو ڈھائی بجے ہم لوگ جب ان کو گھر کی ڈیوڑھی پہ خدا حافظ کہنے

لگے تو آپ کو ناگاہ یاد آیا کہ گھر سے چلتے وقت بیوی نے یہ کہہ کر کہ ــــــ "گھر میں آٹا نہیں ہے۔" ــــــ پانچ روپے ان کی جیب میں ڈال دیے تھے اوپر کی منزل میں اس وقت قمقمہ روشن تھا۔ لیکن ــــــ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

ان کی مستعدی کے کھاتے سے یاد آیا کہ عدم بظاہر جلتے کھوئے کھوئے، سوئے سوئے رہتے۔ ذہن میں اتنے ہی چوکس ہوتے۔ لوگ گفتگو کر رہے ہوں تو وہ عموماً "ٹیوب" میں چلے جاتے۔ اور پھر ایسا لگتا تھا کہ ان کو طبلے کی تھاپ سے جگانا پڑے گا۔ مگر جہاں کہیں موقع آتا دفعتاً "ٹیوب" سے نکل کر ایسی چمکتی ہوئی بات کہہ جاتے کہ محفل جگمگ اٹھتی۔ اگر کوئی جملہ نہیں سوجھتا تو ہر موضوع، ہر کیفیت، وقت اور موسم کے حسب حال کوئی نہ کوئی اپنا شعر یقیناً موجود ہوتا کہ اپنا کلام جس قدر عدم کو یاد تھا کسی دوسرے شاعر کو شاید ہی یاد ہو۔ ان کے بعض حلقہ بگوش نیاز مندوں اور ارادت کیش مداحوں کا تو یہ خیال ہے کہ عدم صاحب کو اپنا سارا کلام زبانی یاد ہے۔ وہ بھی جو طبع ہو چکا ہے۔ وہ بھی جو ابھی طبع نہیں ہوا بلکہ وہ بھی جو ابھی کہنا ہے۔ سچ تو کہا ہے انہوں نے کہ ؎

عدمؔ تم صرف اپنی ذات کو ورثہ گنو اپنا
حریفوں کو حدیثِ شوکتِ اجداد کہنے دو

ذہنی مستعدی کے علاوہ، عدم کی ذہنی دیانت داری اور جرأت پر بھی حیرت ہوتی تھی صرف گفتگو ہی نہیں۔ سماجی زندگی کے ہر دائرے میں اس کا سا ریشم کی طرح نرم و ملائم شخص خال ہی خال دیکھنے میں آتا ہے۔ جس طرح میرے پیرو مرشد مولانا چراغ حسن حسرت اپنی نرم گفتاری کے بہاؤ میں اپنے بیٹے کو بھی "مولانا" کہہ جایا کرتے تھے۔ اسی طرح عدم صاحب گلی محلے میں کھیلنے والے ننھے منے بچوں کو بھی حضور اور جناب کہہ کر بلاتے تھے۔ محبت و مروت، امن و آشتی اور خلق و انکسار کا دوسرا نام عدم ہے۔ وہ دوہرے جثے کے تنومند شخص ہیں۔ لیکن اس تن و توش میں فروتنی ہی فروتنی بھری ہوئی ہے۔ بعض اوقات تو شبہ

ہوتا ہے کہ وہ اپنی کوئی رائے ہی نہیں رکھتے۔ لیکن جناب کیا مجال جو کوئی ایسی بات جو ان کے نظریۂ حیات سے متصادم ہو یا ان کی رائے میں انسان اور کائنات کی عظمت اور آسودگی کے منافی ہو۔ ان کے شعر کی زد سے بچ کر نکل جائے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جتنے گفتنی مضامین آج تک "خوفِ فسادِ خلق" کے سبب سے ناگفتہ رہ گئے تھے۔ عدم صاحب ان تمام کو ریکارڈ پر لا کر چھوڑیں گے۔

بعض لوگ اس پر چیں بجبیں ہو کر کہتے ہیں کہ عدم صاحب بعض اوقات "گفتنی اور ناگفتنی" کی حدود میں امتیاز روا نہیں رکھتے جو چنداں مستحسن بات نہیں ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو ان کی جارحانہ یلغار کا مقصود ہی یہ ہے کہ حدود ان کا راستہ نہ روک سکیں وہ تو بہر حال وہی بات کہیں گے جو وہ کہنا چاہتے ہیں ؎

قتل گاہوں سے خوف کھا کے عدم
عشق کب راستہ بدلتا ہے؟

"بی ایچ کیو" سے نکلنے کے کئی برس بعد عدم صاحب سے راولپنڈی میں جی ایچ کیو (G.H.Q) کے قریب ملاقات ہوئی اب وہ حساب کتاب کے محکمے میں افسری کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ جنگ کے دوران میں بغداد اور بصرہ کے قیام سے ذہن بھی اور چہرہ بھی دو آتشہ ہو رہا تھا تنخواہ ہر چند کافی معقول تھی، لیکن ہوشمندی کی طرف کچھ زیادہ ہی رغبت بڑھ چکی تھی۔ کبھی کبھار تو خود اُن کے بقول ؎

چاندنی راتوں میں ہم پیتے رہیں گے شب بھر
دورِ مہتاب ہے، تھمتے ہی تھمے گا ساقی!

شیشہ و پیمانہ سے عدم کی ہمدمی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں جناب مختار مسعود کے بقول عدم ——— "خرابی اور خرابات کے شاعر ہیں" شراب ان کی گھٹی سے نہیں بلکہ مٹی سے ملی ہے یعنی جب پیسہ ان کے ہاتھ آیا۔ ان کا ہاتھ سیدھا گردنِ مینا پر جا پڑا۔ اور عارضی مسرت کو

اپنی کمائی کا بہترین معاوضہ خیال کیا۔ درمیان میں کئی مرتبہ "خشکی" کے وقفے بھی آتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا:۔ سُنا ہے آپ نے شراب ترک کر دی ہے؟ فرمایا "—میں نے شراب نہیں چھوڑی، شراب مجھے چھوڑ گئی ہے"۔ لیکن اب وہ "دورِ مہتاب" تھے یا جاری رہے، روحانی طور پر ان کے روزانہ کردار کے استحکام کا عالم یہ ہے کہ انکی مستانہ روشی اور جانانہ روی کی وہی کیفیت نظر آتی ہے۔

ظاہر ہے کہ گھر کے مسائل و معاملات اب پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکے تھے۔ مگر عدم سے ان کا "ذوقِ شکر خند" کون چھین سکتا ہے؟ چنانچہ ہر وقت نیاز مندوں کے ہجوم میں گھرے رہتے۔ معمولات کی ترتیب بلکہ افراتفری میں سرِ مو فرق نہیں آیا تھا۔ ملاقات کا وقت باقی صدیقی سے طے ہے اور چلے جا رہے ہیں۔ پروفیسر شوکت واسطی کے ساتھ مشاعرے کا سیکرٹری موٹر لیے کھڑا ہے۔ مگر آپ نکل گئے ہیں۔ میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری کے ساتھ۔ کہاں گئے ہیں؟ کیوں گئے ہیں؟ کب واپس آئیں گے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں! عدم ان معاملات میں "مقدم، مقدم" کے اصول پر کاربند ہیں۔ دوستوں کے لیے وہ ہر وقت محبت کی رہگذر پر چشم براہ بیٹھے رہتے ہیں جو پہلے آ گیا، اپنے ساتھ لگا کر لے گیا جو بندھ گیا سو موتی۔ استاد داغ کے اس مشہور مصرعے کو کہ ؎

حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے۔ بیٹھ گئے

آپ عموماً اس طرح پڑھا کرتے ہیں!

حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے۔ لیٹ گئے

عدم صاحب جب تک کلرک رہے۔ ان کے سپرنٹنڈنٹ، یونٹ اکاؤنٹنٹ اور افسرانِ ان سے عموماً خوش رہتے تھے کہ عدم اتنی اچھی انگریزی لکھتے تھے۔ مگر بعض افسرانِ اعلےٰ اس بات پر خفا بھی رہتے تھے کہ عدم اتنی اچھی انگریزی کیوں لکھتے ہیں؟ ملازمت میں عدم صاحب کے اپنے طرزِ عمل کی اوسط نکال کر دیکھی جائے تو وہ اپنے افسروں کو عموماً آزردہ اور ماتحتوں

کو نہال رکھتے تھے۔ راولپنڈی میں کلرکی کے زمانے میں ایک مرتبہ آپ اپنے بڑے دفتر کی چوڑی سیڑھیاں چڑھتے اوپر جا رہے تھے کہ ان کا ہندو سپرنٹنڈنٹ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ سیڑھیوں کے وسط میں آمنا سامنا ہو گیا۔ تو لالہ جی نے پوچھا۔ "مسٹر آپ ایک بجے سے ساڑھے تین بجے تک کہاں براجمان تھے"؟ —— عدم نے فوراً جواب دیا —— "میں جمعہ پڑھنے گیا ہوا تھا" —— اوپر سے دو اور مسلمان کلرک اتر رہے تھے۔ لالہ جی نے ان سے پوچھا۔ "تم جمعہ پڑھنے کیوں نہیں گئے"؟ انہوں نے جواب دیا —— "آج تو منگل ہے"۔ اس پر عدم نے برجستہ کہا۔ "منگل ہو یا جمعہ میں تو جمعہ پڑھ آیا ہوں"۔ ظاہر ہے کہ پڑھا ہوا جمعہ مشکل ہی سے واپس لایا جا سکتا تھا۔

اب افسری کے زمانے میں ان کی بے نیازی اور فراموش کاری کا بھی ایک واقعہ سن لیجیے۔ ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل الحاج شجاعت علی صدیقی مشاعروں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک محکمانہ مشاعرے میں راولپنڈی کے سرکردہ شعراء کو مشاعرہ گاہ یعنی کمانڈ کنٹرولر کے دفتر کے بڑے ہال میں لانے کی ڈیوٹی عدم صاحب کے سپرد کی گئی تھی، اور آپ نے واقعی شہر کے نامی گرامی شعراء کو لا کر اسٹیج پر بٹھا دیا۔ لیکن موٹر کے آخری پھیرے میں جانے کیا پیچ پڑا۔ کہ مشاعرہ مقطع تک پہنچ گیا۔ مگر عدم کا کوئی سراغ نہ تھا۔ بلکہ ان کے ساتھ دو ایک دوسرے نامور شعرا بھی لاپتہ تھے۔ اگلے روز دفتر میں پیشی ہوئی تو آپ نے اپنے مخصوص بھولپن کے ساتھ الحاج کو خطاب کرتے ہوئے کہا —— "حضور خدا کی قسم میں آ رہا تھا بلکہ شاد امرت سری کو بھی ساتھ لا رہا تھا۔ اس کم بخت نے مجھے راستے میں ذرا ایک جگہ بٹھا لیا۔ اور پھر جب ہم وہاں سے چلے تو بخدا پہلے تو ہال نہ ملا اور جب ہال ملا تو مشاعرہ نہ ملا"۔

میں نے ان کو افسری کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ ڈسپلن کے بغیر کام کے معیار و رفتار کو برقرار رکھنے کا سلیقہ ان پر ختم تھا۔ دفتر کے کلرک تلامذہ غزل کی طرح ہنسی خوشی صبح سے شام تک کام میں جتے رہتے تھے۔ شروع شروع میں تو ہم یہی سمجھتے تھے۔ کہ آپ فائلوں پر ڈرافٹ لکھے

ی بجائے کوئی غزل لکھ کر افسر کی میز پر رکھ آتے ہوں گے مگر قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ عدم
نے اپنی ذات سے یکسر منہ موڑ کر اگر کسی چیز سے مفاہمت کی تھی۔ تو وُہ ملازمت تھی۔ یوں دفتر میں
بھی ان کا عام اسلوب یہی رہا کہ سے

حشر میں لے کے چلو مُطرب و معشوق و سبُو
غیر کے گھر میں کبھی رات بھی ہو جاتی ہے

عدم صاحب گھر میں ہوں، احباب میں ہوں، کسی "تجلّی خانے" یا دفتر کے ظلمت کدے
ں، وُہ ابھی تک "بی ایچ کیو" سے نہیں نکلے۔ اور یہ وُہ منزل ہے :
جہاں تک مسافر بہت کم گئے ھیں!!

اُردو شاعری کا عقابِ اعظم

اگلے روز جب لاہور سے جناب ڈاکٹر صفدر محمود نے یہ اطلاع دی کہ پاکستان نیشنل سنٹر "پرواز عقاب" کی اشاعت پر ایک تکریمی تقریب کا اہتمام کر رہا ہے اور ہماری خواہش ہے کہ تم اس تقریب میں عبدالعزیز خالد کی شاعری پر مقالہ پڑھو، تو میں دل ہی دل میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ ـــــــــــ میں نے سوچا میں تو ان کی بعض کتابوں کے نام پڑھتے ہوئے املا کی چولیں بھی درست نہیں رکھ سکتا، ان کی شاعری پر مقالہ کیا لکھ سکوں گا؟ میں نے عرض کیا! خالد صاحب میرے نہایت محترم اور عزیز دوست ہیں۔ میرا اپنا بہت جی چاہتا ہے کہ اس تقریب میں حاضر ہو کر اپنی باہیں ان کے گلے میں ڈال دوں، مگر آپ جانتے ہیں کہ شعروں کو تنقید کی چھاننی میں چھاننے پھٹکنے کا ہُنر مجھے نہیں آتا۔ ہاں، اگر کچھ لکھا جا سکا، تو "پرواز" اور "عقاب" دونوں کے بارے میں کچھ رَلی مِلی لکھ لاؤں گا۔ "پرواز" کم ہوگی "عقاب" زیادہ ہوگا۔

سیاست کی دُنیا میں تکریم و ارادت کی بنا پر، لیڈروں کو القاب دینے کا رواج ایک مدت سے رائج ہے، ایک دو "شیر" ہر عہد میں موجود رہے ہیں۔ "شاہین" بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ کچھ دوسرے چرند پرند بھی ہوں گے۔ اس تلازمے پر اگر سرکردہ شعرا کو بھی القاب دیئے جائیں، تو میرے خیال میں، عبدالعزیز خالد کو اُردو شاعری کا "عقابِ اعظم" کہنا، کچھ غلط نہ ہوگا، بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے کوتاہی برتی، تو عربی، فارسی والے ان کو اپنا عقاب بنا لیں گے، کیونکہ اپنی تخلیقی جولانگاہ میں وہ زیادہ تر عربی، فارسی ہی پر جھپٹتے ہیں، اُردو کی طرف تو یُوں ہی جھپٹے کے وقت بسیرے کے واسطے پلٹتے ہیں، مگر ہم اُردو والوں کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے کہ یہ عقاب جب بھی اُردو کی طرف آتا ہے، عربی اور فارسی کے بہت سے کارآمد

ـفاظ بھی دُور دُور سے مار لاتا ہے۔

عبد العزیز خالد، محاسن و مقاصد سے لدا پھدا شعر کہتے ہیں۔ پاکستان کے سینئر شعرا ں وہ اپنا الگ مسلک، بلکہ مصلےٰ رکھتے ہیں، اور جس جگہ وہ بیٹھے ہیں، ان کے آگے کوئی دوسرا ٹھا ہوا نظر نہیں آتا۔ اور جس سنگلاخ راستے پر وہ چل رہے ہیں، ان کے پیچھے چلنے والا کوئی کھائی نہیں دیتا۔ یوں بھی "عقاب" ہمیشہ تنہا اڑتا ہے۔ تلیر دل یا مرغابیوں کے مانند غول ندھ کر نہیں اُڑتا۔ آپ دو عقابوں کو ایک ہاتھ سے چھوڑ کر دیکھ لیجیے ایک دائیں کو نکل جائے ، دوسرا بائیں کو، اپنے معاصر اور ہم چشم پرندوں میں عقاب اُونچی، لمبی اور تند و تیز پرواز ں لیے ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ یہی امتیاز عبد العزیز خالد کو اپنے معاصر شعراء میں صل ہے۔ ان کی شاعری بلند آہنگ بھی ہے، بلند پرواز بھی ــــ اور تیز رو بھی، عقاب ہاں گشت پرندہ ہے۔ اس کو پرندوں کا "ابنِ انشا" کہنا چاہیے۔ جو عقاب صبح کے وقت رکستان کے صحرا میں کسی کبکِ دری پر جھپٹا، کچھ عجب نہیں کہ عراق سے آیا ہو۔

خالد کی پروازِ فکر کی رینج (RANGE) نیل سے تا کاشغر پھیلی ہوئی ہے، بلکہ اب تو عقاب ویتنام کی طرف بھی جا نکلا ہے۔ تہذیب و فن، فلسفہ و فکر، بصیرت و حکمت، تاریخ و مدن، الغرض کائنات اور انسان کا کون سا عنوان ہے جو اس کے بال و پر کے نیچے نہ آیا۔ ہیں کہیں تو بصیرت ہی میں عبادت کا سرور بھی میسر آجاتا ہے اور کبھی کبھی تاریخ سے گزر کر جغرافیے میں بھی چلے جاتے ہیں، مگر یہ نہ سمجھیے کہ وہ پرواز کی تیزی یا تندی میں تاریخ کے بوکھٹے سے نکل جاتے ہیں جیسا کہ بعض اوقات جیٹ ہوائی جہاز اترتے وقت رَن وے (RUN WAY) سے آگے نکل جاتے ہیں۔ خالد کے بارے میں یہ بات سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ کیونکہ اپنے فن پر ان کو ایک قسم کی مکمل "جرنیلی کمانڈ" کا عمل دخل حاصل ہے۔ ان کا شعر بیک وقت دل پر بھی دستک دیتا ہے اور دماغ پر بھی۔ ان کا شعر دراصل وہیں جاتا ہے جہاں وہ اس کو بھیجتے ہیں۔ یہ نہیں کہ کئی دوسرے شعرا کی طرح، شعر دل کی طرف روانہ

کریں اور وہ جگر میں تراز د ہو جائے۔ یا زیادہ سے زیادہ کوچۂ یار میں جا کر بیٹھ رہے کہ

مرنا تری گلی میں، جینا تری گلی میں

ان کے فن و فکر کے مختلف شاداب اور وسیع اُفقوں کا کما حقہٗ، تجزیہ کرنا فضلائے تنقید کا منصب ہے۔ میرے ذاتی احساسات میں جو تاثر سب سے زیادہ گہرا ہے، وہ ان کے شعر میں "چونکاہٹ" کا عنصر ہے، وہ اپنے قاری کو، شروع سے آخر تک، "پنجاں بھار" یعنی ONTHE TOE رکھتے ہیں۔ مجھے ان کی کوئی ایسی نظم یاد نہیں آ رہی جو پڑھنے کے بعد اچھا خاصا "ہوم ورک" (HOME WORK) نہ دے گئی ہو۔

میں جن دنوں خالد صاحب کو صرف ان کی نظموں کے ذریعے ہی سے جانتا تھا مجھے ان سے ملتے ہوئے کچھ ڈر سا لگتا تھا۔ ان کی نظمیں دیکھ کر گمان ہوتا کوئی عرب شاعر ہے جو ایران میں سے ہوتا ہوا ہمارے ہاں آ نکلا ہے۔ بعض اوقات الفاظ کی سطح مُرتفع اس قدر دشوار ہوتی کہ آدمی پہلے مصرعے پہ ہانپ کر بیٹھ جائے۔ ان کے جاں نثار قارئین کے متعلق ہم نے یہ روایت سنی تھی، کہ وہ بے چارے ان کی تصنیفات کو پہلے کئی کئی روز تک اپنے بُک شیلف میں مولانا محمد حسین آزاد کے لکھے ہوئے اُردو کے قاعدوں کے ساتھ لگائے رکھتے ہیں۔ کہ شاید ان کی صُحبت میں رہنے سے یہ قدرے آسان ہو جائیں۔ بہر کیف ہمارے ذہن میں ان کا "ایمج (IMAGE) ایک نہایت ثقہ اور نستعلیق بھرے بھرے اور پھلے پھولے عالم فاضل شخص کا تھا کہ ہم ان کی جوتیاں تو سیدھی کر سکتے تھے، مگر اُن کے گلے سے لپٹ کر قہقہہ لگانے کا حوصلہ نہ رکھتے تھے۔ اور نہ آرزو۔ دراصل ہم طبعاً کمزور اور بے توفیقے لوگوں میں سے ہیں۔ لیکن خالد صاحب اپنی نظموں کی تیزی و تہہ داری، گونج اور فوں فاں سے، ان مستعد اور چوکس لوگوں کے زُمرے میں دکھائی دیتے ہیں۔ جو اگر اوپر اٹھ جائیں تو زمینوں اور آسمانوں میں نہیں سماتے اور اگر زمین پر رینگنے لگیں تو چپا چپا اللہ لوک کے مُرغوں کی طرح، دن بھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کچھ یہ وہم سا بھی تھا کہ

ان کی گفتگو کا ترجمہ کون کرے گا؟ پہلی مرتبہ جب میں نے کسی رسالے میں ان کی تصویر دیکھی، تو غزالوں جیسا ٹبک، سڈول، گلبدن سا نوجوان دیکھ کر یقین نہ آتا تھا کہ یہ ہلکا پھلکا متبسم شخص "غزل الغزلات" کا شاعر ہو سکتا ہے۔

یہ تو ابتدا کی بات تھی۔ بعد میں جب ہمیں اپنے دوستوں، مشتاق احمد یوسفی، ابن انشا اور کرنل محمد خان کی وساطت سے ان کے بارے میں یہ اطلاعیں ملنے لگیں کہ خالد صرف شاعر کے طور پر ہی قدرے مشکل ہیں، آدمی کے طور پر نہایت آسان ہیں، تو ہمارا خوف کچھ کم ہوا۔ اور جب دسمبر ۱۹۷۲ء میں ایک روز اسلام آباد میں وہ اچانک میرے دفتر میں تشریف لے آئے تو ان سے مل کر جی نہال ہو گیا۔ ان کے چہرے پر عربی فارسی کی ایک سلوٹ بھی تو نہ تھی، شاعری جتنی سنجیدہ تھی، باتیں اتنی ہی شگفتہ۔ شعر پر تکلف، پر شکوہ اور مرصع، خود سادہ، درویش منش، اور کھلے کھلے۔ شاعری میں فولاد، زندگی میں ریشم بلکہ ان کے الفاظ میں حریر و پرنیاں خالد اس وقت اٹھارہ کتابوں کے مصنف (پرواز عقاب ان کی انیسویں کتاب ہے) اور اٹھارہ ہی محکموں کے سربراہ تھے۔ اکثر ادیبوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ آدھ سیر ہوں تو اپنے کو ڈیڑھ سیر بتلاتے ہیں۔ خالد کے انکسار کا یہ حال ہے کہ حالانکہ ان کی ایک ایک کتاب ڈیڑھ ڈیڑھ سیر کی ہو گی، لیکن وہ اپنے آپ کو ڈیڑھ سیر بھی نہیں کہتے۔

کتابوں کی بات پر یاد آیا کہ آپ نے مجھے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ (SET) عطا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے مگر جب کبھی راولپنڈی آتے ہیں، معذرت کر دیتے ہیں ——— اب کے بار، میں اس مرتبہ ہوائی جہاز سے آیا ہوں۔ یوں بھی وہ کتابیں درآمد کرتے ہیں، برآمد نہیں کرتے۔ ان کے پاس کتابوں کا نہایت وسیع اور وقیع ذخیرہ ہے۔ علم نے ان کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ ان کا بس چلے تو رکابیوں، دیگچیوں وغیرہ کو اٹھوا کر، باورچی خانے میں بھی کتابوں کے شیلف رکھوا دیں۔ ان کے گھر کو "دولت خانہ" کے بجائے کتب خانہ

کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

عبدالعزیز خالد کی علمی و ادبی پیداوار کی مقدار اور معیار کو دیکھ کر ہمیشہ حیرت ہوتی کہ یہ شخص مضامین نو بہ نو کے انبار لگانے کے لیے اتنا وقت، اتنی یکسوئی کہاں سے نکال لاتا ہے؟ ملاقات ہوئی تو میں نے سب سے پہلے یہی سوال پوچھا کہ حضرت، آپ اپنی اس قدر مصروف زندگی میں اتنا کچھ لکھ لیتے ہیں؟ آپ جیسے مصروف شخص کو ایسی وزن دار شاعری کی اٹھارہ کتابیں لکھنے کے لیے اٹھارہ برس جیل میں رہنا پڑتا ہے۔ اس پہ وہ بس مسکرا دیتے۔ وہی کارلائل والی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہلکی سی مسکراہٹ جو اُن کا زیور بھی ہے اور زرہ بھی ؂

نہیں عتاب زمانہ خطاب کے لائق

ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا — حفیظ

جب ان کو ذرا تفصیل سے دیکھا، تو اندازہ ہوا کہ اگرچہ سرکاری طور پہ تو آپ کبھی قید نہیں ہوئے مگر رضاکارانہ طور پہ ایک "زنجیرِ رمِ آہو" اپنے پیروں میں ڈال رکھی ہے خالد ان نابغوں میں سے ہیں جن کو قدرت، بصیرت کے ساتھ ساتھ عزم و ہمت کا بھی وافر جوہر عطا کر دیتی ہے یہ لوگ بچپن سے نکلتے ہی شاہراہ حیات کے تمام موڑ، پل، پگیاں اور سنگ میل گن لیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ سفر کی سمت اُن پہ بالکل واضح ہوتی ہے، بلکہ منزل کا نقشہ بھی ہر وقت سامنے رہتا ہے۔

ہوچی منہ کے بقول: ایک سیدھا سادہ سائیں، لے لوٹ کھرا شخص ——— وہ چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ کہ افلاک سے نالوں کا جواب بھی آنے لگ گیا۔ یعنی اشعار ان پہ اترنے شروع ہو گئے۔ اور لگتا تو یوں ہے کہ عبدالعزیز خالد نے اسی وقت اس لائن میں "عزیزِ جہاں" ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کی زندگی بہر حال اسی محور پہ گھومتی دکھائی دیتی ہے روٹی ایک وقت کھاتے ہیں، شعر دو وقت کہتے ہیں۔ اپنا وزن کبھی بڑھنے نہیں دیتے تا کہ شعر کا وزن بڑھ سکے۔ گھر میں آنے کے بعد، گھر سے باہر کم ہی نکلتے ہیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بیگم

یا بچے یا ملازم سنتے ہیں، خود دل کی گھنٹی پہ کان لگائے رکھتے ہیں۔ ہر وقت کچھ پڑھ رہے یا کچھ لکھ رہے ہیں۔ اُردو ادبیات کی ذیل میں لکھا گیا شاید ہی کوئی لفظ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگا۔ مگر جب خود کچھ لکھتے ہیں، تو خالص اپنی فیکٹری کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ نئے نکور، نادر، جڑاؤ مرصع۔ ان کی تحریریں دیکھ کر بعض اوقات یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ دوسروں کی تحریریں پڑھتے ہی نہیں۔ الفاظ ان کے ذہن میں دھان اور گیہوں کی طرح اُگتے ہیں۔ اُن کے معمولات اور مشاغل کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ان کی شاعری کی "سپلائی لائن" (SUPLY LINE) میں کوئی خلل نہ آنے پائے مثلاً صبح نہار مُنہ ورزش میں وہ سر کے بل کھڑے ہوتے ہیں، تو اس لیے کہ ان کا شعر اپنے قدموں پر کھڑا رہ سکے۔ دوسری جنگِ عظیم کا ایک معمر ویٹرن (VETREN۰) گنر پنڈا خان ہمارے یونٹ میں "سویلین آفس بوائے" کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس کے تجربات کا نچوڑ تھا کہ توپ کے نیچے زمین جتنی سخت ہوگی گولہ اتنا ہی اونچا جائے گا خالد صاحب بارہ مہینے زمین پر سوتے ہیں تاکہ ان کا شعر آسمان کی خبر لاسکے۔ وہ زندگی میں لذت سے زیادہ افادیت کے قائل ہیں۔ مونگ پھلی چھلکے سمیت تناول فرماتے ہیں۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ رات کو دو چار کتابیں تکیے کے نیچے ہوتی ہیں۔ ملازمت غالباً اس لیے کرتے ہیں کہ بال بچوں کے علاوہ اپنے کتب خانے کا پیٹ بھر سکیں۔ خالد ان اصحابِ خیر میں سے ہیں جو خود تشنہ رہتے ہیں مگر زندگی کو سیراب کر جاتے ہیں۔

ترجمے کے فن میں خالد خاص میلان و ملکہ رکھتے ہیں سیفو ہو یا ٹیگور وہ اصل مصنف کی انگلی پکڑ کر نہیں چلتے، بلکہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی رُوح پہ ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ ان کا ترجمہ رسمی یا آئینی نہیں ہوتا، ذوقی اور تخلیقی ہوتا ہے غیر زبان کی کافر سے کافر نظم کو مسلمان کر کے وہ اسے کچھ اس چاؤ چونچلے سے اپنے ادبی معاشرے میں جذب کر لیتے ہیں کہ نظم نو وارد تو ہوتی ہے اجنبی نہیں ہوتی بعض اوقات تو وہ دوسری زبان کی نظموں کو گویا بیاہ کر اپنے رُوپ میں مستقلاً بھی لے آتے ہیں۔

گذشتہ برس جب اسلام آباد میں ان سے ملاقاتوں کا سبب ہوا، تو ترجمے کی طرف ان کا میلان بہت بڑھا ہوا تھا۔ "پرواز عقاب" کی پروازیں تازہ تازہ اُڑ رہی تھیں۔ راولپنڈی کی ادبی محفلوں میں جب کبھی کلام پیش کرتے، انہیں تراجم میں سے ایک آدھ "پرواز" سنا یا دکھا دیا کرتے۔ ایک لمبی پرواز تو ان کی زبان سے ہم نے عین ایک ایسے مقام پر سنی کہ عقاب اگر نشیمن بناتے ہیں، تو اسی جگہ بنانا چاہیے۔ یہ پشتو کے غیر فانی شاعر خوشحال خان خٹک کا مزار تھا۔ ان دنوں ترجمے میں ان کی لگن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہو چی منہ کے بعد وہ بعض دوسرے مصنفین کا رُخ بھی کریں گے اور ان کی آؤٹ پُٹ (OUT PUT) کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد، انگریزی کی کوئی قابل توجہ کتاب شعر، ترجمے کی محتاج نہ رہے گی میری طرح کے ذہنی طور پر پس ماندہ قارئین کو تو یہ توقع بھی ہو چلی تھی کہ خالد صاحب لگے ہاتھوں بعض اپنی کتابوں کا بھی ترجمہ کر ڈالیں گے۔

قدرت نے خالد صاحب کو غیر معمولی طور پر زرخیز ذہن بخشا ہے، مگر اس کو جلا، ان کی لگن اور تپسیا سے ملی ہے ان کی زندگی، شعر و ادب کی بلندی کے لیے ایک مجاہدے کا سا انداز رکھتی ہے وہ جس ریاضت سے اپنے باغِ سخن کی آبیاری کرتے ہیں، اس کا ثمر یہ ہے کہ ان کے باغ میں کچا ثمر لگتا ہی نہیں اپنی تیز بینی اور تیز رفتاری کی بے پناہ صلاحیت کے صدقے میں، مہینوں کا کام دنوں میں نمٹا دیتے ہیں اس کا تجربہ مجھے ان کے ہمراہ ایک سفر میں ہوا۔

اتوار کی ایک ٹھٹھری ہوئی صبح تھی کہ اچانک خالد صاحب تشریف لے آئے۔ ارشاد فرمایا: "چلو خوشحال خاں خٹک کے مرقد پہ حاضری دے آئیں" یہ میری بھی ایک دیرینہ آرزو تھی پشاور آتے جاتے اکوڑہ خٹک سے گزرتے وقت دل ہمیشہ مزار کی سمت جھک جاتا۔ مگر مزار سڑک سے چند میل ہٹ کر دامن کوہ کی طرف واقع ہے — ادھر ہمارے پاس کبھی وقت نہ ہوتا اور کبھی حوصلہ نہ ہوتا۔ اب تو یہی سوچ رہے تھے۔ کہ شاید مزار

خود ہی کسی وقت سڑک پر آجائے۔ ایسے میں خالد صاحب جب یہ تجویز لے کر آئے تو گویا کنواں پیاسے کے پاس چل کر آگیا۔ ہم جیسے بیٹھے تھے، اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لیے۔

گھر سے نکلتے ہی ارشاد فرمایا: "کہو تو سلطان رشک کو بھی ساتھ لیتے چلیں۔ دوستوں کے بغیر سفر بے مزہ ہوتا ہے۔" میں نے عرض کیا "بے شک سلطان رشک بڑی خوبیوں کا نوجوان ہے۔"

اب سلطان رشک شہر کے ایک ایسے گنجان تجارتی علاقے میں رہتے ہیں کہ اُدھر جائیں تو ایسا لگتا ہے کہ سارا شہر اسی علاقے میں رہتا ہے۔ باربرداری کے تمام ریڑھوں ٹھیلوں، ٹرکوں، اونٹوں اور گدھوں کا ہیڈ کوارٹر اسی علاقے میں واقع ہے بورلوں کنستروں میں جو سامان باہر سے راولپنڈی آتا ہے۔ پہلے یہیں آتا ہے، نکلتا ہے تو یہیں سے نکلتا ہے عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ موٹر کی سواری کے خوگر ہو جاتے ہیں وہ انبوہِ عوام میں چلنے پھرنے کے آداب بھول جاتے ہیں۔ اسلام آباد کے میرے ایک دوست ترکاری بازار میں گھی کا کنستر لینے گئے۔ تو ماتھے پر کنستر کھا کر آئے۔ مجھے ڈر تھا خالد صاحب وہاں کسی ریڑھے سے نہ ٹکرا جائیں مگر خالد صاحب تھے کہ ریڑھوں اور ٹھیلوں وغیرہ کے ہجوم میں اکبر الٰہ آبادی کے مشہور و معروف "آب لو ڈور" کی طرح گزرتے چلے جا رہے تھے ——— سرکتے ہوئے اور سمٹتے ہوئے چلکتے ہوئے اور لپکتے ہوئے۔ ایمرجنسی ہو تو خالد صاحب سوئی کے ناکے میں سے بھی گزر سکتے ہیں۔ وہ اگر بڑے شاعر نہ ہوتے تو بہت بڑے اتھلیٹ ہوتے۔

؏ بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا

ٹیکسلا سے کچھ پہلے، جنرل نکلسن کی لاٹ کے پاس، مغلوں کے زمانے کی سڑک کا ایک ٹکڑا اب تک بچھا ہوا ہے۔ اس پر نظر جا پڑی تو موٹر روک کر، اس سڑک کی پیمائش کو چل پڑے سڑک تو خیر ڈیڑھ دو فرلانگ جا کر تاریخ میں غائب ہو جاتی ہے لیکن آپ تاریخ کی

جس لہر پر سوار ہو گئے تھے۔ اگر میں اور سلطان رشک، ہاتھ جوڑ کر ان کا راستہ نہ روک لیتے تو شاید رواتے کے قلعے میں جا نکلتے۔ خدا کا شکر کہ ٹیکسلا کے کھنڈرات آپ کے چھاتے پھٹکے ہوئے تھے۔ مگر ہماری بدقسمتی کہ حسن ابدال میں آپ پہلی مرتبہ قدم رنجہ فرما رہے تھے۔ اور یہ وہ خطہ ہے کہ اس کے چشموں اور شادابی کے باعث اس کو ممتاز انگریز شاعر ورڈز ورتھ (WORDSWORTH) کا "دیوانِ مصوّر" سمجھنا چاہیے۔ کئی آثارِ قدیمہ بھی ان مرغزاروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں لالہ رُخ کا مقبرہ بالخصوص اس وجہ سے قابلِ ذکر ہے اس میں لالہ رُخ کی قبر سرے سے موجود ہی نہیں۔ خالد صاحب نے ایک ایک چشمے کا گیت سُنا، ہر پرانی عمارت کو گلے لگا کر ملے اور راستے میں جتنی بھی نئی اور پرانی مسجدیں آئیں، ان کے اندر جا کر نمازیوں کی ویلفیئر (WEL FARE) کے انتظامات کا جائزہ لیا۔ مگر اس کے معنی تھے سات آٹھ میل کی پیدل گردش اور جب وہ آثارِ قدیمہ کی طرف جاتے ہیں تو چل کر نہیں جاتے، دوڑ کر جاتے ہیں۔ انہیں شاید اس بات کا دھڑکا رہتا ہے کہ ان کے پہنچنے تک آثارِ قدیمہ کہیں بالکل ہی نہ مرجھا جائیں۔

ہمارا اگلا پڑاؤ اٹک کے قلعے پر تھا۔ ہم خیال کر رہے تھے کہ مغلوں کی سڑک اور لالہ رخ وغیرہ نے ہل ہلا کر ان کو خستہ کر دیا ہو گا، مگر اس بوڑھے قلعے کو دیکھ کر آپ دوبارہ جوان ہو گئے۔ چنانچہ جوانوں کی طرح کلکاریاں بھرتے، فصیلِ قلعہ پر جہاں تک ہاتھ پہنچتا تھا، ایک ایک اینٹ پر دستِ شفقت پھیرتے تاریخ کے ساتھ سرگوشیاں کرتے، دریائے سندھ میں اتر جانا چاہتے تھے مگر اس مہم میں ہم ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ اٹک کے مقام پر دریائے سندھ ان کی شاعری سے بھی تین چار مشخص نسبتیں رکھتا ہے۔ مثلاً دونوں بہت گہرے ہیں دونوں کے کنارے بلند ہیں، دونوں بلند آہنگ۔ آگے جا کر دریا کا پاٹ بھی ان کی شاعری کی طرح چوڑا ہو جاتا ہے۔

خوشحال خان کے مزار پر حاضر ہوتے، تو آپ قلبی کیفیت کے ایک ایسے گہرے اور طویل

لوٹے میں غائب ہو گئے کہ ہم تو ان کی بازیابی کی طرف سے ناامید ہو چلے تھے۔ ہم نے تو صرف فاتحہ پڑھی۔ آپ خوشحال بابا سے گویا ملاقات بھی کر آئے۔ سچ ہے ع

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

مزار پر حاضری کے بعد واپسی کا پروگرام تھا، مگر خالد صاحب بجید و ضعدار انسان ہیں کہنے لگے۔ "کرنل فصیح الدین احمد اور بیگم رضیہ فصیح الدین احمد (اُردو کی ممتاز ناول نگار) آج کل رسالپور میں ہوتے ہیں، جی نہیں مانتا کہ اتنے قریب آ کر ان سے ملے بغیر لوٹ جائیں"

سوا کوڑہ خٹک سے رسالپور پہنچے۔ مگر اتنے میں پشاور بقدر تیس میل ہمارے قریب آ گیا۔ اب وہ احمد فراز، محسن احسان، تاج سعید، فارغ بخاری اور خاطر غزنوی کا تذکرہ کچھ اس پیرائے میں کرنے لگے کہ اگر ہم رسالپور سے راولپنڈی واپس چلے گئے تو یہ لوگ کیا کہیں گے۔ لیکن میں نے اور سلطان رشک نے ان کی ایک نہ چلنے دی، لہذا ناچار ان کو راولپنڈی کی طرف چلنا پڑا۔ اور جب ہم راولپنڈی پہنچے، تو رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ اور خود راولپنڈی بارش میں بھیگ رہا تھا۔ میں تو اس رات ایسا ٹوٹ کر سویا کہ اگلے روز دفتر میں بھی دیدہ دل ہی کھول کر بیٹھا رہا۔ البتہ جب سہ پہر کو ان سے ملاقات ہوئی، تو ایک معرکہ آرا تازہ نظم ان سے سننے کو مل گئی اور جب وہ نظم سنا رہے تھے، تو بلائی زبان کی یہ کہاوت میرے ذہن میں کسمسا رہی تھی۔

"لومڑ مرنے کے بعد اپنی کھال، اور عقاب شہرت چھوڑ جاتا ہے"

اور عقاب میرے سامنے بیٹھا رومال سے اپنی چونچ، یعنی ناک رگڑ رہا تھا۔

اُردُو ادب کی دخترِ صحرا

میں ایک کم مطالعہ شخص ہوں۔ ناول سے خاص طور پر "الرجک" ہوں۔ محرومی سراسر میری ہے۔ مگر طبیعت ادھر نہیں آتی۔ سارا قصور طبیعت کا بھی نہیں۔ ہم خود بھی تو اپنے حق میں قاتل رہے ہیں۔ بچپن میں جن ناولوں تک ہمارا ہاتھ پہنچا۔ وہ سب کے سب خطِ مستقیم میں فلاحِ دارین سمیٹنے یا دوسروں کے علاقے فتح کرنے کی غرض سے لکھے گئے تھے ؎

نہ ادائے کافرانہ ، نہ تراشِ آذرانہ

ان میں واقعات و مکالمات کی اتنی فالتو چربی جمع تھی کہ کتاب رحل میں رکھ کر پڑھنی پڑتی۔ کرداروں کی فوجِ ظفر موج۔ ایک لڑکی درجنوں عشاق کے نرغے میں۔ ایک انار صد بیمار۔ ان کی حاضری کے لیے باقاعدہ رجسٹر رکھنا پڑتا۔ بلکہ دو رجسٹر۔ کیونکہ بیشتر کردار "بستر ب" میں رکھنے کے لائق تھے۔

دوسری جنگ عالم گیر میں جب جرمنی کی سانس اکھڑنے لگی تو ہٹلر کو مشورہ دیا گیا کہ پہلی جنگ عالم گیر کے "تمغہ درگلو" فیلڈ مارشل وان رن اسٹیڈ کو ریٹائرمنٹ کی چارپائی سے اٹھوا کر، محاذ جنگ پر "اٹن شن" کر لو۔ اس پر فیوہرر نے جواب دیا۔ رفیقو! اس جھٹ پٹے کے سمے کسی چٹک مٹک پھرتیلے جرنیل کا نام بتاؤ جو مٹھی بھر سپاہیوں کو لے کر دشمن کی صفوں میں گھس جائے۔ رن اسٹیڈ جیسا کلاسیکی فیلڈ مارشل تو پچاس ڈویژن فوج کے بغیر لڑائی کا پینترہ باندھنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی کنیڈے کے ایک سپہ سالار سے ہمارا سابقہ ایک تاریخی ناول میں پڑ گیا تھا۔ موصوف گھڑ سواروں کے میر لشکر تھے۔ ناول کے پہلے تین ابواب جو غالباً کمانڈر انچیف کے "ڈائریکٹر ری مونٹ (REMOUNT) نے قلمبند کیے تھے۔ گھوڑوں کے حسب نسب،

چال چلن، خوراک مع ناشتہ اور گھوڑوں کو لاحق ہونے والی بیماریوں کی تفصیل سے لبریز تھے۔ داگ سے جیسے باجا۔ اگلے باب میں لشکر یلغار بولنے پر آیا تو یکایک کوارٹر ماسٹر جنرل نے انکشاف کیا کہ گھوڑوں کی کاٹھیاں تو تمام "اشوع" (ISSUE) ہو چکی ہیں۔ جنوبی محاذ کا سامان شمالی محاذ پر پہنچ گیا تھا۔ پانی کی چھاگل کا خانہ تو موجود تھا مگر نیزہ اُڑسنے کا خانہ، کارخانے ہی میں رہ گیا تھا۔ کسی سابقہ معرکے میں شاید گھوڑوں کی "کاژلٹی" (CASUALTY) بھاری ہو گئی تھی یا شاید ان کی وفاداری ڈگمگا گئی تھی کہ اس مرتبہ سپہ سالار نے ایک ایک گھوڑے پر دو، دو سوار بٹھلا رکھے تھے۔ ہاتھی کے دانتوں کی طرح، ان میں سے ایک سوار کھانے یعنی لڑنے کے لیے تھا اور دوسرا دکھانے یعنی بڑبڑانے کے لیے تھا۔ نمبرا کا فرض ہلّہ بولنا تھا جس کی نوبت ناول کے خاتمے تک نہ آسکی۔ البتہ نمبر ۲ جو پیچھے سے نعرے لگاتا، یا کوئی نغمہ الاپتا یا تحت اللفظ میں خطبۂ شجاعت پڑھتا، واقعی بے حد مصروف تھا۔ نیزہ بھی اسی کی تحویل میں لٹک رہا تھا گھوڑے بدک کر اگلے سُم اٹھاتے تو بیس بیس صفحات دوڑتے چلے جاتے۔ وہ تھمتے تو اگلے بیس صفحات میں خطبۂ شجاعت گونجتا رہتا ؎

ن و گرز و میدان و افراسیاب

ان ناولوں کے پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے سانپ کی دہشت نہیں ہوتی، کچھ ایسی ہی دہشت ناول کی طرف سے ہمارے دل میں بیٹھ گئی۔ آج تک یہ عالم ہے کہ چوڑے ہاڈ کاٹھ کا ناول دیکھ لوں تو دل بیٹھ جاتا ہے بقول شادؔ عظیم آبادی ؎

کہاں سے لاؤں صبر حضرتِ ایوبؑ اے ساقی
خم آئے گا، صراحی آئیگی، تب جام آئے گا۔

محترمہ جمیلہ ہاشمی کے لکھے ہوئے کی میں نے جتنی شہرت سنی ہے، اتنا ان کا لکھا ہوا پڑھا نہیں۔ میں نے رسائل میں شدہ شدہ ان کی کہانیاں پڑھی ہیں، یا اب اس تقریب کے لیے اپنے آپ کو لیس کرنے کی خاطر ان کی اولین تصنیف ناول "تلاشِ بہاراں" اور تازہ ترین کتاب "اپنا

جہنم" پڑھا ہے۔ تلاش بہاراں" پوری "جہنم" تین چوتھائی۔ "تلاش بہاراں" جس پر انہیں آدم جی انعام ملا۔ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ اور تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر محیط ہے درمیان میں "آتش رفتہ" اور "آپ بیتی جگ بیتی" ان کی دو اور کتابیں چھپ چکی ہیں۔

بہت سی مشکلات آدمی اپنے لیے خود پیدا کرتا ہے۔ مثلاً میری بہت سی مشکلات میری اس عادت کی پیداوار ہیں کہ میں فیصلے تو شاید صحیح کرتا ہوں۔ مگر کرتا عموماً غلط وقت پر ہوں یہی دیکھیے کہ مجھے اس تقریب میں لکھنا تو "اپنا اپنا جہنم" پر تھا۔ مگر لکھ کر لایا ہوں "تلاش بہاراں" پر۔ حالانکہ یہ نئی کتاب انسانوں کی نئی نسل کی طرح، "تلاش بہاراں" کی بہ نسبت کہیں چھریری اور سمارٹ تھی "لہو کا رنگ" "زہر کا رنگ" اور "شب تار کا رنگ" کل تین جہنم۔ یعنی تین طویل مختصر افسانے یا مختصر طویل ناول۔ آدمی ادھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ شتابی سے فارغ مگر ہم نے سوچا کہ ان کے ادبی سفر کا "کھرا" نقطہ آغاز سے کیوں نہ چلائیں۔

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اصولی طور پر تو یہ فیصلہ کچھ غلط نہ تھا۔ کہ آگے کی بات سمجھنے کے لیے پیچھے کی بات کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے، البتہ ایک غلطی جو کتاب سے زیادہ حساب کی غلطی تھی، یقیناً سرزد ہوئی وہ یہ کہ اس فیصلے کے بعد دونوں کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے وقت، مجھ ایسے نوکری پیشہ شخص کے پاس نہیں رہ گیا تھا۔ مطالعہ بھی کوئی "رن تھرو" (RUN THROUGH) مطالعہ نہ تھا کہ آدمی فراٹے بھرتا، اسٹیشن چھوڑتا، اُڑا چلا جائے۔ ذمہ داری کا تقاضا تھا کہ عبارت چبا چبا کر پڑھی جائے۔ صرف و نحو کے ابرووں کو ٹھہر ٹھہر کر دیکھا جائے اور مغز و استخواں کو خوب ٹھونک بجا کر پرکھا جائے کہ ——— ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟ ادھر تقریب اتنے میں سر پہ آ پہنچی۔ خیر "تلاش بہاراں" تو ہم نے پڑھ لی۔ البتہ "اپنا اپنا جہنم" کے "لہو رنگ" میں داخل ہو کر "زہر رنگ" سے نکل ہی رہے تھے کہ ہماری کتاب، ہمارے محترم جناب غلام عباس صاحب اٹھا کر لے گئے کہ اس تقریب کی صدارت کے لیے کچھ "ساز و یراق"

ہب صدر کو بھی درکار تھا۔ قصہ مختصر۔ اب یہ بسیط ناول ہے اور ہم ہیں دوستو!

دیر سے اٹھ کے کعبے آیا میرؔ
جس کو چاہے خدا خراب کرے

یوں "اپنا اپنا جہنم" بھی جتنا کچھ ہم نے دیکھا، "تلاش بہاراں" ہی کا نورِ چشم معلوم ہوا کا پیرہن البتہ زیادہ جھلملاتا ہے۔ کٹ (CUT) نئی ہے، کسا ہوا بھی زیادہ ہے اور رفتار یز ہے۔ پیرہن سے خیال آیا کہ بے شک کتاب کے اندر بھی انسانی اندوہ کی آگ ب رہی ہے، لیکن سرِ ورق کے ڈیزائن میں تو گویا بانس کے جنگل کو آگ لگ گئی ہے۔ جہنم" کی املا کی چڑھی ہوئی تیوریاں، اور کھنچی ہوئی بھنویں دیکھ کر ہی آدمی سہم جاتا ہے لتا ہے، جیسے شردھا اور شانتی کے مندر کے سامنے کوئی خشمگیں مہنت آلتی پالتی مارے ہے۔ میرا آبائی وطن جہلم ہے۔ میں نے تو پہلی خواندگی میں "جہنم" کو جہلم ہی پڑھا۔

رسم زمانہ کے مطابق، چاندی کے ورقوں والے چند تقریظی جملے بھی، سرِ ورق کی بغلی ر پہ آراستہ کیے گئے ہیں کہ جا اینجا است۔ ہر جملہ، آنا سجل، من موہن اور میٹھا کہ پڑھنے ہن میں مصری گھلنے لگے بہاولپور کا خطہ جمیلہ کا مسکن ہے، پیروں، فقیروں کی سرزمین ہے۔ اسی رعایت سے یہ چند جملے تعویذ کے طور پہ، کسی نقاب پوش فقیر سے لکھوائے گئے ہیں۔ بایت برمحل عنوان کے تحت۔ یعنی "فقیر کا مشورہ"۔ ویسے اگر یہ رسم چل نکلی تو سپاہی ادیب ہدیق سالک کی کتاب پہ کسی جرنیل کے رشحاتِ قلم درج ہوں گے۔ اور عنوان ہوگا "کار
(ORDER OF THE DAY)"

جمیلہ ہاشمی ہمارے ادب کی بڑی دھوم دھامی شخصیت ہیں۔ انہوں نے ادب کو چمکایا، ے اور چونکایا بھی۔ پنجاب کی سرزمین کے ٹھیٹھ دودھ دہی میں نہائے ہوئے پس منظر میں ، بجاتے اور چمٹے کھڑکاتے ہوئے اُٹھیلے ہرنام سنگھوں اور "سلفے دی لاٹ ورگی" ہرنام ں کی اندرونی و بیرونی زندگی کی جیسی بھرپور، توانا اور "سوادلی" عکاسی جمیلہ نے کی ہے

کسی دوسری خاتون افسانہ نگار نے نہیں کی ـــــ یا نہیں کر سکی، یا مجھے اس کا علم نہیں
میں قیاس کر رہا تھا کہ تلاش بہاراں کا تار بھی سکھوں ہی کے گریبان سے کھینچا گیا ہوگا۔
مگر دیکھا تو اس ناول نے زنار پہن رکھا ہے۔ یعنی ہندوانہ معاشرت میں رنگا ہوا ہے اور
لطف یہ کہ وہ اس فضا میں اسی طرح "ایٹ ہوم" (AT HOME) نظر آتی ہیں، جیسے مچھلی پانی
میں۔ یہ کوئی اوپر اوپر سے چوکے کی لیپا پوتی نہیں۔ وہ تو صدیوں کے پاتال میں اتر
کر دیو مالائی رسموں، ریتوں کی روح کو کھرچ لاتی ہیں۔ اور جب ان کے سایوں، رنگوں اور
جذبوں کو قلمبند کرتی ہیں تو برج بھاشا کے ہلکے پھلکے، بانسری بجاتے ہوئے بانکے بہاری لفظوں
میں سے سچ مچ کا سوم رس چھلکنے لگتا ہے۔ چنانچہ "تلاش بہاراں" کے مطالعہ سے جتنی آگہی آتی
ہے، اتنی ہی ہندی اور سنسکرت بھی آجاتی ہے، یہ ناول تو خیر انہوں نے تمام کا تمام ہندوستان
کے جغرافیے میں لکھا ہے۔ لیکن فضا کہیں کی بھی کیوں نہ ہو۔ "تلاش بہاراں" اور "اپنا اپنا جہنم"
میں ایک بات طے معلوم ہوتی ہے۔ کہ اپنے ہاں کے جانے پہچانے، عزیز و اقارب مسلمان
کرداروں اور آس پاس، اوپر تلے کی زندگی کو وہ اپنا موضوع نہیں بنائیں گی۔ یہ ایک عجیب
نازک سا سوال بلکہ سوالیہ ہے۔ جس کے لیے کسی مصنف سے جواب طلب بھی نہیں کیا جا سکتا۔
مگر یہ سوال پوچھنا بھی پڑتا ہے؟

یہ ناول آزادی کے ہنگامہ پر برپا ہونے والے خوں آشام فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناک
پرچھائیوں میں لکھا گیا ہے۔ جب برصغیر کے باسیوں نے انسان کا چولہ نوچ کر، وحشی درندوں
کے دانت اور پنجے اور کھالیں اوڑھ لی تھیں۔ گویا جمیلہ نے پت جھڑ کی زبردست آندھی میں
موسم بہار کی تلاش شروع کی ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ اس ناول کی بنیادی "تھیم"
(THEME) عورت ہے ـــــ عورت کی مظلومیت، آزادی، انفرادیت، اس کے خواب
آرزوئیں، سو، سو بار مرنے جینے کی ادا، عربدہ جوئی۔ کج کلاہی قلم کو کروشیے کی طرح استعمال
کرتے ہوئے، جمیلہ نے ایک کہانی میں کئی کہانیاں بُن ڈالی ہیں اور یہ سب کہانیاں، زندگی کی

باہنوں میں باہنیں ڈال کر چلتی ہیں۔

خیالات کی اکائیاں، ان کے فن میں، سوالات کی صورت میں اُبھرتی ہیں ——— کیا عورت ایک چٹان ہے؟ کیا اس کو پتھر کا رُوپ بھلا لگتا ہے؟ کیا وہ انارکلی بننا پسند کرتی ہے؟ کیا وہ ایک الگ ہستی ہے؟ کیا عورت اپنے سے بہتر عورت کو برداشت نہیں کر سکتی؟ کیا انسان کئی راہوں کا مسافر ہے؟ محبت دکھ ہے؟ سُکھ ہے، سکون ہے، راستہ ہے، منزل ہے، کیا ہے؟ ——— کیا انسان کے چاروں طرف اندھیرا ہے، تنہائی ہے؟ یہ اور ایسے کتنے ہی دوسرے سینۂ آدم میں کھٹکتے، خُون میں لتھڑے سوالات قدم قدم پر قاری کے ذہن کو چونکاتے چلے جاتے ہیں۔ جمیلہ کا مقصود، ادراکِ صداقت اور انکشافِ حقیقت ہے، ناول ان اندھیروں، اور تنہائیوں سے گزرتا ہوا سچائی کی تلاش کا ایک راستہ ہے کہ ؎

فسانے میں حقیقت سے زیادہ لطف ہوتا ہے
حقیقت کو برائے مصلحت افسانہ کہتے ہیں۔

"تلاشِ بہاراں" میں کرداروں کا اچھا خاصہ میلہ جمع ہے۔ ساہوکار، کاشتکار، مہاجن، انجھی، برہمن، ویش، دانش ور، صحافی، طبلچی پھر ان میں آگے فن کار، ہوس کار، نیکوکار، الغرض بھانت بھانت کی مخلوق۔ حتیٰ کہ ایک انگریزیہ خاتون اور ایک انگریزیہ مرد بھی، لنگوٹی باندھ کر ہندوانہ سوسایٹی کے اندرونی سنگھٹن میں کُود پڑے ہیں۔ اس ہجوم کو دیکھ کر ماتھا بھی کچھ ٹھنکا کہ کہیں فیلڈ مارشل ڈن اسٹیڈ کی طرح ٹڈی دل تو اکٹھا نہیں کیا جا رہا؟ لیکن اس سارے ہجوم کو مصنفہ نے جس خوش اسلوبی سے نظم و ضبط کے سانچے میں ڈھال کر، ہر کردار کو اپنے اپنے کام دھندے پر لگا دیا ہے اس کو دیکھ کر انکی انتظامی صلاحیتوں پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے۔ واقعات ایک قدرتی بہاؤ میں تیرتے ہوئے آتے ہیں اور کردار؟ کیا مجال جو کوئی ایک منشی بھی کہیں بیکار بیٹھا ہوا، خواہ مخواہ کھانستا، ٹہلتا یا اونگھتا ہو ملے۔ حد یہ ہے کہ ساڑھے سات سو صفحات میں، کنول کماری ٹھاکر جیسی، آکسفورڈ پاس

سوشل کاموں میں شرابور، کالج کی پرنسپل، انتہا درجے کی خلیق اور مہمان نواز خاتون کے گھر میں اس کی ملازمہ تیرا، یہی کوئی دو چار مرتبہ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہے کنول کماری کوئی ذیلی کردار نہیں کہ جگنو کی طرح ٹمٹما کر بجھ جائے۔ وہ ناول کی سرکاری "ہیروئن" ہے۔ جو کہانی کے ساتھ ساتھ بلکہ ساری کہانی کو اپنی مٹھی میں لے کر اس طرح چلتی ہے کہ اگر خدانخواستہ وہ کہیں رک جائے۔ تو بظاہر کہانی کے آگے چلنے کا کوئی انتظام نظر نہیں آتا۔ تو جناب اسی کیفیت میں، شروع سے آخر تک۔ اگر دو تین دیگ چائے مہمانوں اور ملاقاتیوں میں تقسیم ہو جاتی تو یہ کوئی "اسراف بے جا" نہ ہوتا۔ مگر جمیلہ کی جزرس نگاہوں نے کہیں بھی چائے کا لنگر نہیں کھلنے دیا۔ اور یہ فن اس کی کڑی گرفت کا ثمرہ ہے کہ پھیلاؤ کے باوجود یہ ناول پایاب نہیں۔ نہ ہی قاری کو کہیں الجھن یا تکان کا احساس ہوتا ہے۔ جمیلہ کا فن توازن کے حسن کا فن ہے دو ایک جگہوں پر مثلاً جہاں مشرق و مغرب کے مابین گویا "موازنہ انیس و دبیر" شروع ہو گیا ہے یا پھر جہاں شوبھا بینرجی، لمبے لمبے خط لکھنے بیٹھ جاتی ہے۔ اس بے مثال توازن میں قدرے جھول کا احساس ہوتا ہے۔ مگر یونہی بس ذرا سا جو نتھا۔ ورنہ پھر وہی ان کا رسیلہ اندازِ نگارش جو اس پر گلاب اور چنبیلی کی پنکھڑیاں برسانے لگتا ہے۔

کہانی میں اگرچہ زیادہ تر — ، عورتیں آپس میں لڑتی ہیں۔ مگر فلسفیانہ سطح پر، عورت اور مرد کے درمیان ایک مناظرے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں تو یہ ناول عورت کی طرف سے مرد کے خلاف باقاعدہ "چارج شیٹ (CHARGE SHEET)" کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن جمیلہ کے سلیقے، رکھ رکھاؤ اور عالی ظرفی کو آفرین کہیے کہ کوئی ہلکی سی تلخی بھی کہیں پیدا نہیں ہونے پائی۔ اس کا اہتمام انہوں نے یوں کیا ہے کہ اگر کہیں کوئی کرخت بات ناگزیر ہو گئی ہے تو وہ عورت ہی سے کہلوائی ہے۔

"تلاشِ بہاراں" میں یوں تو کئی اونچے اونچے اور گہرے گہرے مسئلے اٹھائے گئے ہیں، مگر سب مسئلوں کی بنیادی انسان اور عورت کی طرف جھکی ہوئی ہے وہ عورت کی

انفرادیت کی پرجوش حامی ہیں۔ مگر آزادی کی اتنی آنچ کھائی ہوئی صورت بھی انہیں پسند نہیں جس سے عورت میں کرختگی آجائے۔ اس کے پیکر میں بھی اور رُوح میں بھی۔ عورت کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی غرض سے، جمیلہ نے اپنے اس ناول میں عورتوں کو بڑی بڑی کٹھن آزمائشوں سے دوچار کیا ہے۔ اور علم و دانش کے موتیوں سے کاڑھی ہوئی قیمتی چادر ان کے سر پر ڈالی ہے، لیکن ڈھاک کے وہی تین پات کہ عورت باہر سے کچھ بھی ہو، اندر سے محبت کی جویا رہتی ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو کنول کماری ٹھاکر جیسی چٹان کے رُوپ کی، آکسفورڈ پاس عورت علم و دانش کی پوتھی اتنی خالی خالی، پھٹی پھٹی اور ویران ویران کیوں نظر آتی کہ جیسے ــــ ویراں ہو بھرا شہر بیاباں سے زیادہ ــــ محبّت کی آسودگی کے بغیر کنول ٹھاکر بھی کچھ ان چڑیوں کی طرح لگتی ہے۔ جن کے بارے میں جمیلہ نے لکھا ہے کہ:

"شروع سے آخر تک، زندگی کی ایک تنہائی سے دوسری تک پیڑ دل پر بیٹھی رہتی ہیں"

ادب میں جمیلہ کا غلغلہ محض مسائل حیات کی گتھیاں سلجھانے کی وجہ سے نہیں ہے اس میں خوبیٔ تحریر کا بھی نمایاں شائبہ شامل ہے۔ جمیلہ کے اسلوبِ نگارش کی دیو مالائی ملاحت ملائمت، کا کچھ ذکر پہلے آچکا ہے۔ مگر اس سلسلے کی ایک دوسری بنیادی چیز کو ہم نے الگ باندھ کر رکھ لیا تھا۔ وہ چیز ہے ان کے اسلوبِ تحریر پر مناظرِ فطرت کی دھوپ چھاؤں۔ یہ دھوپ چھاؤں ان کے اپنے زرعی ماحول کی طمانیت، شادابی اور کھلے پن سے عبارت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ریت کے ٹیلے، بادل اور ستارے، درخت، پھول، پتّے، کپاس اور سرسوں کے کھیت ان سے باتیں کرتے ہیں۔ فطرت سے اس گہرے اور شیر و شکر رابطے نے ان کی تحریروں کو ہرا بھرا بنا دیا ہے۔ وہ فطرت کے کسی منظر کو دیکھتی ہیں تو اس کا سارا رنگ تمام روشنی، اپنی رُوح میں جذب کر لیتی ہیں اور پھر دیوداسیوں کی سی لگن کے ساتھ یہ سارا رنگ، یہ تمام سونا، اپنی تحریر میں گھول دیتی ہیں۔ جمیلہ اُردو کی دخترِ صحرا ہے۔ "تلاشِ بہاراں" جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا، اس دور کی عکاسی کرتی ہے۔ جب

ہندوستان اور پاکستان آزادی کی دہلیز تک آپہنچے تھے۔ یہ زمانہ برصغیر میں شدید سیاسی خلفشار اور انسانی کرب کا زمانہ تھا۔ تاریخ ایک فیصلہ کن دوراہے کی طرف مڑ رہی تھی۔ "تلاشِ بہاراں" کا مطالعہ کرتے وقت، یہ احساس خاصی دور تک، ذہن میں سر سراتا رہتا ہے کہ خیالات کا دھارا قیامِ پاکستان کے خلاف جا رہا ہے۔ مطالعہ کے دوران، کئی موقعوں پر خود مجھے اندر سے ایسا لگا۔ جیسے میں باہر سے سُرخ ہوتا جا رہا ہوں۔ کبھی بینا کہتی ہے ـــــ "بٹ کر ملک کی شکتی کم ہو جائے گی" ـــــ کبھی کوئی دوسرا کردار ڈھنڈھی پیٹتا ہے ـــــ ہم مرکر بھی ہندو مسلم نہیں ہو سکتے۔ ہم صرف انسان ہیں" ـــــ لیکن میری بر سمی میری بھول تھی۔ میں یہ بھول رہا تھا کہ ناول کے کرداروں کی زبان میں تو اس وقت کی اجتماعی ہندو ذہنیت بول رہی تھی۔ وہ لوگ بول رہے تھے جو زبانی کلامی تو انسانیت کا دعویٰ کرتے تھے، مگر جب فسادات کی آگ بھڑکی تو انہوں نے بھیڑیوں کا رُوپ دھار لیا۔ ان سے تو وہ طوائف اچھی رہی جس نے مظلوم مسلمان لڑکیوں کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ میرے نزدیک کہانی جوں جوں آگے بڑھتی ہے واقعات کا دھارا، ایک قدرتی و منطقی انداز میں پاکستان کی حمایت کی طرف رُخ کر لیتا ہے۔ جیسے حقائق بین السطور سے چھلک اٹھے ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جمیلہ عوامل کی نشان دہی باقاعدہ سنگِ میل نصب کر کے نہیں کرتی۔ اور یہ بھی کہ اس کے بات کہنے کا ـــــ خوش دِل و گرم اختلاط، سادہ اور روشن حسین انداز ـــــ نفرت کے شعلوں کو ہوا دینے والا نہیں۔ اس کا آدرش محبت ہے وہ امن اور شانتی کی دیوی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ نفرت کے شعلے بھڑکتے ہیں تو سب سے پہلے ان میں عورت بھسم ہوتی ہے، اس کا جسم بھی، اس کی رُوح بھی ـــــ جمیلہ نے کسی مقام پہ ایک جملہ لکھا ہے ـــــ "وہ جب ہمیں اپنے بازوں میں لٹکا کر چک پھیریاں دیتا تو یُوں لگتا، جیسے آنکھوں میں تارے گھوم گئے ہیں" ـــــ "تلاشِ بہاراں" زندگی کو ایسی ہی "چک پھیریاں" دینے والے آدرشوں کا صحیفہ ہے۔ ہر موڑ پہ قدریں ٹوٹتی، اصول

پاش پاش ہوتے نظر آتے ہیں۔ زندگی کے لہولہان راستے پر، قدم قدم پر، دلوں کے ٹوٹنے کی صدا سنائی دیتی ہے۔ آرزوں کا شاید ہی کوئی نگینہ ٹھیس سے محفوظ رہا ہو۔ افق کو کہر کے دبیز کمبل نے اندھا اور بہرا کر دکھا ہے۔ کائنات، لاشوں سے پٹا ہوا میدانِ جنگ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پھر عجیب بات ہے کہ دل میں امید کی قندیل بجھنے نہیں پاتی۔ بلکہ دھند اور دھوئیں کی اس اوڑھنی میں سے، ہر آن، ایک زندہ و تابندہ پیکر طلوع ہوتا نظر آتا ہے جمیلہ کا اپنا پیکر ــــــ ایک عورت کا پیکر ــــــ اس عورت کا پیکر جس کی بازیافت کے واسطے "تلاشِ بہاراں" لکھی گئی ــــــ وہ عورت، جو حیات کی قوت بھی ہے، نمو بھی اور آبرو بھی ــــــ جو اس کے بقول ــــــ ایک ہیرے کی طرح اپنے ہر نئے رُخ سے، کسی اور ہی رنگ میں چمکتی ہے ع

سینوں میں تپش ہے، کبھی شورش ہے سرِ دل میں
کیا چیز بسا دی گئی مٹی کے گھروں میں

ادب میں لال قلعوں کا معمار

میرے دوست ایوب محسن موٹروں اور لاریوں کے ایک وسیع "فلیٹ" کے مالک ہیں۔ چنانچہ بات بھی سمندِ ناز پر سوار ہو کر کرتے ہیں۔ ایک روز ٹیلیفون پر فرمایا۔ "پنڈی میں طفیل صاحب کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جا رہا ہے"۔

میں نے کہا۔ "نہایت مناسب تجویز ہے"۔ پھر میں نے اپنے مافی الضمیر کو مولانا ابوالکلام کے ایک جملے میں لپیٹ کر اس طرح پیش کیا "محاسن کا حق ہے کہ انکی شہادت دی جائے"۔ ایوب محسن بولے۔ "آپ کو اسی شہادت کے لیے طلب کیا گیا ہے۔ آپ طفیل کے بارے میں ایک شخصی مضمون لکھیں گے"۔ اس پر میں نے معذرت کے لہجے میں اپنی مشکلات کی نشاندہی کی۔ عرض کیا۔ ان کے کارناموں کی تو میرے دل میں بے حد قدر ہے۔ لیکن ان سے ذاتی ملاقاتوں کی پونجی بہت ہی قلیل ہے۔ گنتی کی دو، تین ملاقاتیں۔ وہ بھی ایسی بھاگتی دوڑتی ہوئی کہ صورت نظر آ جائے۔ مگر صورتِ حالات نظر نہ آئے۔ ایوب محسن کے جواب کا لب لباب یہ تھا کہ رجز میں رَل یعنی طفیل میں نقوش ملا کر چلئے کہ طفیل اور نقوش کوئی الگ چیزیں نہیں ہیں۔ ایوب محسن نے آخر کہا

"آپ نے طفیل کو جتنا دیکھا ہے اتنا ہی سہی"۔

میں نے کہا "تو پھر شخص نہیں ہو گا۔ شخص پارا ہو گا"۔

وہ بولے۔ "منظور"!

"نقوش" اردو کے ان مجلّوں میں سے ہے جو گھٹنوں چل چل کر جوان نہیں ہوئے بلکہ براہِ راست عالمِ شباب میں پیدا ہوئے اور غالباً اپنی عمر کے معاصرین میں تنہا مجلّہ ہے کہ کچھ

مدت ہسپتال میں رہنے کے باوجود اس کی صحت اور جوانی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا بلکہ اس کی چھب اور پھبن میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ طفیل اس کے روح رواں تھے۔ مگر روحِ رواں کی طرح اندر ہی اندر کہیں گردش کرتے رہتے تھے۔ ابتدا میں ایک خاصی مدت تک وہ مکتبۂ فروغِ اردو زیادہ اور "نقوش" کم تھے۔ نقوش کا غلغلہ عام تھا۔ مگر طفیل کا نام خواص تک ہی محدود تھا۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ ہم لوگ یعنی کرنل مسعود احمد کیپٹن انعام اللہ قاضی اور میں ان دنوں راولپنڈی سے "بادِ شمال" کے نام سے ایک روزنامہ نکالتے تھے جس کے قدم ہمارے قدم کی طرح جمنے سے پہلے اکھڑ چکے تھے۔ انعام قاضی ہمارے شعبۂ انتظامیہ کے "باس" تھے۔ طفیل ان کے چھوٹے بھائی عطاء اللہ قاضی کے ساتھ دیوارِ دبستاں پر لام، الف لکھتے رہے تھے سو ایک روز انہیں عطاء اللہ کے طفیل، طفیل صاحب ہمارے دفتر میں آنکلے مگر بس چھوٹے مشرقی بھائیوں کی طرح بڑے بھائیوں کے سامنے مراقبے میں بیٹھ کر چلے گئے۔ انعام قاضی چونکہ ان سے زیادہ ان کے بزرگوں کو جانتے تھے۔ لہٰذا تعارف پر بزرگانہ شفقت کی دودھ ملائی چھڑکتے ہوئے بولے "طفیل بہت ہی شریف لڑکا ہے..."

طفیل اس وقت واقعی، ایک پتلا دبلا، نوخیز، شرمیلا سا لڑکا ہی تھا۔ طفیل گئے تو مسعود آگئے۔ مسعود ہم دونوں کے "باس" تھے، اپنے اندر جھانک کر، اپنی کوتاہیوں کو ڈھونڈ کر اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے کے عمل میں خود اپنی ذات کا ان سے زیادہ سخت گیر دشمن کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ اخبار کے معاملات میں ہماری تن آسانی اور بے تدبیری پر وہ اپنے سمیت ہم تینوں کو اکثر لعنت ملامت کرتے رہتے تھے۔ اب اخبار کے "تین بڑوں" کی کانفرنس شروع ہوئی انعام نے انتظامی امور کی تمہید بھی طفیل ہی کے نام سے اٹھائی بقول شخصے

موضوعِ گفتگو تو مری جاں کچھ اور تھا
دورانِ گفتگو میں تری بات آگئی

کہنے لگے۔ "ابھی ابھی طفیل اٹھ کر گئے ہیں"۔

"اچھا وہ اپنے آرڈیننس والے طفیل راجہ" —— مسعود بولے۔ "سنا ہے۔ اب لیفٹیننٹ کرنل ہو گئے ہیں"۔ "ارے بھئی وہ تمہارا طفیل نہیں، ہمارا طفیل" انعام نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "مکتبۂ فروغِ اردو والا طفیل، بھئی اس لڑکے نے کمال کر دیا۔ سوچتا ہوں، ہم بھی اخبار بند کر کے مکتبہ کھول لیں"۔

مسعود نے تجویز کو یک قلم رد کر دیا۔ بولے "اخبار تو خود بخود بند ہو جائے گا۔ لیکن ہم سے مکتبہ بھی نہیں چل سکتا۔ کوئی سا بھی کام ہو، اگر اس کے پیچھے بھرپور لگن نہ ہو —— بے پناہ محنت نہ ہو، مکمل منصوبہ بندی نہ ہو، تو کام آگے نہیں بڑھتا"۔ مسعود نے یہ بات طفیل کے حوالے سے نہیں کہی تھی لیکن طفیل نے زندگی میں عزت و اہمیت کا جو مقام حاصل کیا ہے، میں سمجھتا ہوں یہ بڑی حد تک ان کی اپنے کام میں سچی لگن، بے پناہ مشقت اور جامع منصوبہ بندی کا ثمرہ ہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد لگاتار اٹھارہ برس تک ان سے کسی باقاعدہ ملاقات کا کوئی موقع نہ آیا۔ طفیل صاحب اس عرصے میں پیچھے ناشر کی مسند سے اٹھ کر آگے ایڈیٹر کی کرسی پر درانہ آبیٹھے تھے اور ترتیب کے علاوہ تخلیق کے مراحل میں بھی بڑی تیزی سے نقش آرائی کر رہے تھے آپ نے کچھ اس دھج دھوم، شان اور شکوہ قامت اور جسامت کے خاص نمبر شائع کیے کہ بابائے اردو کے لیے نقوش کا خاص شمارہ "رسالہ کاہے کو تھا توپ خانہ تھا"۔ پطرس نمبر دیکھ کر علامہ نیاز فتح پوری نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر طفیل میری موت پر اسی ڈیل ڈول کا نمبر شائع کرنے کا وعدہ کریں تو میں ابھی مرنے کو تیار ہوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ خاص شمارے نکالنے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں جسامت ہی نہیں "نقوش" کی صحت بھی قابل رشک ہوتی ہے۔ وہ محنت، ذہانت اور نفاست سے اپنے خاص شماروں کو علم و ادب کی تاریخی دستاویز بنا دیتے ہیں۔ میں تو کہوں گا۔ کہ وہ ادب

اور تہذیب کی حفاظت اور سر بلندی کے واسطے عظیم الشان قلعے تعمیر کرتے ہیں۔ اور ان کی شہ نشینوں اور شیش محلوں، درباروں اور دالانوں میں دور دراز کی دشوار گزار کانوں سے ایسے ایسے موتی اور ہیرے کاٹ کر، ڈھونڈ کر، سجا دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ نقوش کے ہر خاص نمبر پر حرفِ آخر نہ سہی، حدِ آخر کا گمان ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ادبیات کا "یہ" کولمبس ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی "نیا" "براعظم" ڈھونڈ لاتا ہے۔ "نقوش" طفیل کی محبت کا سودا ہے یہ الگ بات ہے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ محبت انہیں راس بھی آگئی ہے۔

جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں۔ اس عرصے میں میری ان سے کوئی باقاعدہ ملاقات نہ ہو سکی البتہ ایک بے قاعدہ سی ملاقات مسلسل جاری رہی۔ میں جب کبھی لاہور جاتا ایبک روڈ پر چودھری عبدالحمید کے مکتبۂ کارواں پر عموماً ضرور جاتا۔ طفیل صاحب کا مکتبہ ان کی بغل میں واقع تھا۔ سو اس کوچے میں آتے جاتے ان کو ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔ کبھی پروف پڑھ رہے ہیں۔ کبھی کتابیں بیچ رہے ہیں۔ کبھی ادیبوں کے سامنے چائے رکھ کر خود ان کی صورت تک رہے ہیں۔ کبھی لکھنے میں مصروف۔ کبھی کاغذوں کے ساتھ گتھم گتھا ہوئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھتے ہوں گے اور جیسا کہ بعد میں خود انہی سے معلوم ہوا واقعی دیکھتے تھے۔ لیکن دونوں طرف سے بس وہی نگاہ استعمال ہو رہی تھی۔ جو بظاہر نگہ سے بھی کم ہوتی ہے۔ خدانخواستہ ہم میں کوئی کھچاؤ نہ تھا۔ البتہ ملاقات برائے ملاقات کے لیے بے دست و پا کر دینے والا کوئی ذاتی لگاؤ بھی موجود نہ تھا نہ اس طرف تمنا تھی نہ اس طرف طلب آخر میں جب بھید کھلا تو بیچ میں سے غالب کا مصرع نکلا ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

طفیل اس مغالطے میں تھے کہ میں ان کو پہچان نہیں رہا۔ میں اس غلط فہمی میں تھا کہ وہ مجھے نہیں پہچان رہے۔ واقعہ یہ تھا کہ خواہ کوئی کتنا ہی رانی خان ہو، خواہ مخواہ تعلقات پیدا کرنے کے شوق میں راستہ روک کر کسی سے ملاقات کرنے کے نہ وہ قائل تھے نہ میں۔

مجھے طفیل کی یہ ادا پسند آئی۔

مئی ۱۹۶۸ء میں ماہنامہ "اُردو ڈائجسٹ" کے نامور مدیر جناب الطاف حسین قریشی نے میرے محترم دوست اور اُردو کے صاحبِ طرز مزاح نگار کرنل محمد خان کی کتاب "بجنگ آمد" کی رونمائی کے لیے لاہور میں ایک تقریبِ خاص کا اہتمام کیا تو وہاں طفیل صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی اور نہ معلوم کیوں انہوں نے کرنل محمد خان، کیپٹن صدیق سالک اور مجھے اگلی دوپہر کو ایک ہوٹل میں کھانے کی دعوت دیدی۔ اور نہ معلوم کیوں ہم نے یہ دعوت قبول کر لی۔ دعوت میں جاکر محسوس ہوا کہ انہوں نے دعوت کا تردّد غالباً یہ دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ ہم لوگ کھانا کتنا کھاتے ہیں اور کس طرح کھاتے ہیں؟ وہ کھانے میں تو شریک ہوئے لیکن گفتگو کا صرف ایک آدھ لقمہ ہی لیا یا دیا ادھر کرنل محمد خان اور ہیں بھی ٹیبل ٹاک کے دھنی نہیں، نتیجہ یہ کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا لمبا چوڑا کورس تیس چالیس منٹ میں ختم ہو گیا۔ ہوٹل سے آپ ہمیں اپنے ادارے میں لے گئے۔ اور ازراہ محبت نقوش کے تازہ تین منزلہ خطوط نمبر کے گرانڈیل مگر دلنواز پیکٹوں کا تحفہ عطا فرمایا۔ ان سے رخصت ہوئے تو "خطوط نمبر" ہمارے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ ہم اس کے ہاتھ میں تھے۔ "نمبر" کیا تھا نمبروں کا بریگیڈ تھا، جس کے ساتھ مسلسل کئی روز تک پُر لطف نبرد آزمائی جاری رہی اب بھی ہمیں محاذ چھوڑ گئے ہیں ورنہ وہ بدستور راستہ روکے کھڑا ہے بعض اوقات خاموشی ہی خاموشی میں جو مسافت طے ہو جاتی وہ گفتگو میں نہیں ہوتی۔ اب جو ملاقاتوں کا دروازہ کھلا تو دو تین ماہ بعد راولپنڈی میں ایک ہی دن میں، ان سے دو ملاقاتیں ہو گئیں۔ جن میں ہم نے ان کے منہ سے چند ایسے چمکتے ہوئے فقرے سُنے کہ بس لطف ہی آ گیا ؏

سنگ یوں تراشا کہ رخسارِ بتاں بننے لگا

محاورے کی رُو سے لوگ عموماً دو چار ملاقاتوں میں کھل جاتے ہیں۔ طفیل صاحب کے بارے میں فی الحال یہ اندازہ تو ہو گیا ہے کہ دو چار ملاقاتوں میں کھلنے نہیں پاتے۔

لیکن یہ اندازہ ابھی نہیں ہو سکا کہ کتنی ملاقاتوں میں کھُل سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لوگوں سے وہ پہلی ملاقات ہی میں کھُل جاتے ہوں اور بعض سے کھُلتے ہی نہ ہوں یعنی ؎

اُو بُود من نہ بُودم و من بُودم اُو نہ بود

البتہ ان ملاقاتوں میں یہ احساس ضرور ہوا کہ آپ بولتے کم ہیں دیکھتے، سنتے اور سمیٹتے زیادہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، اس میں احتیاط سے زیادہ ان کے انکسار کا اقتضا بھی شامل ہے پھر ان کی مسلسل اور گراں بار مصروفیت ؟ ؎

کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

نقوش کا کوئی ایک خاص نمبر ہی پوری زندگی کی مصروفیت کے لیے کافی ہوتا ہے اس اس حالت میں ان جیسے مصروف شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ بولنے پر لکھنے کو اور کام کرنے کو ترجیح دیں۔ شاندار اور دیرپا کارنامے سرانجام دینے والے افراد میں یہ خوبی عموماً موجود ہوتی ہے ـــــــ بہرحال یہ سب میرے ذاتی قیافے ہیں جو قبل از وقت بھی ہو سکتے ہیں ؎

نہیں زنجیر بھی محرم کہ دیوانوں پہ کیا گزری

طفیل صاحب کی ذات کو جب میں ان کی تحریروں، ان کے کارناموں اور ان کی زندگی کے آئینے میں دیکھتا ہوں تو ایک ایسے شخص کا ایمج (IMAGE) ابھر کر سامنے آتا ہے جو کسی بلند، دشوار گزار پہاڑ کی تلہٹی میں پیدا ہوا ہو۔ بے وسیلہ بے سروسامان لیکن فیضانِ قدرت سے فیضیاب اس نے چوٹی کی طرف دیکھا اور پہاڑ کو سر کرنے کی امنگ اس کے دل میں پیدا ہو گئی۔ لوگ مسکرائے کہ میاں ـــــــ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے ؟ نہ تیشہ، نہ رسی نہ آکسیجن بعضوں نے برملا ٹوکا کہ پہلے اس پہاڑ کا جغرافیہ تو پڑھ لو۔ تم اس کے پیچ و خم سے ناواقف ہو۔ چوٹی کی ہوا میں تمہاری سانس رک جائے گی۔ تمہارے لیے بس یہی کافی ہے کہ اوپر جانے والے لوگوں کے لیے نیچے ترائی سے پانی، راشن سپلائی کرتے رہو یہ اندیشے بے بنیاد بھی نہ تھے، مگر یہ شخص اپنی دھن کا پکا تھا۔ وہ سفر پر روانہ ہو گیا۔ اور دُنیا

دیکھ رہی ہے کہ وہ کس طرح قدم قدم پر اپنے ہاتھوں سے پتھر اور چٹانوں کو تراشتا ہوا چوٹی کی طرف برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ نقوش کے مختلف خاص شمارے، اس طویل، کٹھن سفر کے مختلف مرحلوں پر طفیل کے آباد کردہ وسیع اور شاداب کیمپ ہیں۔ وسیع سے وسیع تر، خوب سے خوب تر، کیمپ نہیں، قصبے اور شہر وہ انجنیئر ہی نہیں "آر کی ٹیکٹ" یعنی خلاق بھی ہے۔ دنیائے ادب کے ان شہروں میں اس کے اپنے ذہن سے نکلے ہوئے خیابانوں کا حسن بھی دیدنی ہوتا ہے۔ شخصیت نگاری میں اس کا سُبک، میٹھا، بے تکلف اور شگفتہ اسلوب اپنی ایک الگ چھل بل اور کشش رکھتا ہے طفیل، میرے نزدیک، لگن، خلوص اور دریافت کے اسی فاتح جذبے کا نام ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ طفیل پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ اس پہاڑ کی کوئی چوٹی نہیں ہوتی۔ اس کی چوٹی افق کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔

لگن اور محنت کی بات کرتے ہوئے خود طفیل نے اپنے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ــــــ ایک ایک نمبر پر اتنی اتنی محنت کی ہے کہ ان کی جان پر بن آئی ہے۔ جن دنوں کوئی خاص نمبر زیرِ ترتیب ہوتا ہے۔ تو ان کا دس بارہ پونڈ وزن کم ہو جاتا ہے ــــــ پچھلے دنوں ملاقات ہوئی تو ان کا وزن دس بارہ پونڈ بڑھا ہوا نظر آیا۔ قارئین کو "نقوش" کے ایک اور خاص نمبر کی توقع رکھنی چاہیے!

(۱۹۷۰ء)

ادب کا حجرۂ شاہ مقیم

راولپنڈی ریلوے اسٹیشن کے نواح میں علاقہ صدر کی آبادی کا ایک حصہ محلہ فضل حق کے نام سے موسوم ہے۔ اس محلے سے گزرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ پہلے پہل علاقہ صدر کی آبادی اسی محلے کے گلی کوچوں سے نکل کر اِدھر اُدھر پھیلی ہوگی۔ بڑی سڑک سے محلہ کے اندر جائیے تو ایک محراب دار ڈیوڑھی سے گزرتے ہی ایک چھوٹا سا چوک آتا ہے جس میں سے پتلی پتلی گلیوں کی ترشول نکل کر گھروں میں جذب ہو گئی ہے۔ عزیز ملک کے آبائی مکان کی دہلیز اسی چوک سے اٹھتی ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے کے دیسی شرفا کی تمدنی ضروریات کے مطابق تعمیر شدہ یہ مکان، دو الگ الگ مردانہ اور زنانہ حصوں میں منقسم ہے زنان خانے کی بڑی حویلی میں ان کا گھر بستا ہے، مردانے کی بیٹھک میں یہ خود لیٹے رہتے ہیں۔ اس طرف جتنی ترتیب ہے، اس طرف اتنی بے ترتیبی۔ کمرہ بے شک خاصا بڑا ہے مگر پچھلے تیس برس سے کاغذ کا جو پرزہ ایک مرتبہ اس نیم روشن "عزلت آباد صدف" کے اندر آگیا ہے۔ پھر باہر نہیں جانے پایا۔ کمرے میں ایک پلنگ ایک میز، چند الماریاں اور چند کرسیاں رکھی ہیں جہازی سائز کے میز پر، جو نہ جانے کب سے ان کے پلنگ کی پٹی سے لگا ہوا ہے، کتب و کاغذات مع اشیار متفرق کا اتنا بڑا انبار جمع ہو گیا ہے کہ کوئی ملاقاتی جب پہلی بار یہاں آئے تو کچھ دیر تک اس کو یہی سمجھ نہیں آتا کہ میز کہاں سے شروع ہوئی اور عزیز ملک کہاں ختم ہوئے بارہا ایسا ہوا کہ میں نے میز سے "بالِ جبریل" اٹھاتے عزیز ملک کا گھٹنا بھی اٹھا لیا۔ انھوں نے اپنی ضرورت کی ہر چیز یا یوں کہیے کہ آنسو کی ہر بوند کو گوہر نایاب بنانے کا سارا کارخانہ اسی میز پر جمع کر رکھا ہے نتیجہ یہ کہ ضرورت کے وقت ان کو یہاں مطلوبہ چیز کم ہی

مل پاتی ہے۔ ایک روز شیو بنانے کا برش ڈھونڈھ رہے تھے۔ مگر مل نہ رہا تھا۔ البتہ جدھر دیکھئے میز ہو یا کرسی بس کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں ——— کتابوں سے اگر کوئی جگہ بچ گئی ہے تو وہاں قطار اندر قطار، چھوٹی بڑی بوتلیں کھڑی ہیں۔ جن سے کبھی ان کا آبائی مطب آباد تھا، علم کتابوں میں، ہنر بوتلوں میں ان کے بیچوں بیچ عزیز ملک آتش دیدہ گیلی لکڑی کے مانند سلگتا ہوا، مزید برآں منہ میں سلگتا ہوا سگریٹ بھی۔ اردو زبان کے صاحب طرز مزاح نگار شاعر نذیر احمد شیخ مرحوم اس کمرے کو راولپنڈی کا ادبی "حجرہ شاہ مقیم" اور عزیز ملک کو راولپنڈی کا قطب کہا کرتے تھے کہ کوئی دوسرا دوست گھر پہ ملے نہ ملے، عزیز ملک اپنے حجرے میں ضرور مل جاتے۔ راولپنڈی شہر کی گذشتہ تقریباً چالیس برس کی ساری ادبی تاریخ میری نظر سے گزری ہے، اس عرصے میں راولپنڈی کی اپنی مٹی سے جو دو چار ادبی آستانے ابھرے ہیں۔ ان میں عزیز ملک کا حجرہ ایک بلند "بگوڈے" کی حیثیت رکھتا ہے۔

"راول دیس" عزیز ملک کی دسویں کتاب ہے۔ اتنی ہی دیگر تصانیف کے "مسودات" آنکھوں میں کاجل کی ڈوری تک سجے ہوئے، ان کے حجرے میں پڑے ہیں اس موقع پر، مجھے کہنا تو یہ چاہیئے تھا کہ "راول دیس" زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آگئی ہے۔ مگر یہ میں نے عمداً نہیں کہا کیونکہ عزیز ملک کی تصانیف زیور طبع سے تو آراستہ ہوتی ہیں لیکن منظر عام پر آنے کی بجائے ان کے حجرے میں پڑی رہتی ہیں۔ عزیز ملک دور حاضر کا ایک باکمال انشا پرداز ہے۔ اس کی تخلیقات عصری ادب کی پہلی قطار میں جگہ پاتی ہیں۔ اس کی سی، بالغ، پرشکوہ، پرشفقت من بھاؤنی نثر آج تک کم اہل قلم لکھ سکے ہیں۔ وہ کاتنے اور بھاگنے کا قائل نہیں۔ وہ ایک ایک لفظ چن کر، تول کر، تراش کر لکھتا ہے۔ اس کے جس فقرے کو نچوڑ کر دیکھیے، ایک بوند خون چھلک کر باہر آجائے گا۔ اس کا اپنا خون جگر۔ وہ اپنے موضوع کو پہلے پرندوں کی سی ماتا کے ساتھ "چوگا" کھلاتا ہے۔ پھر قرطاس پر منتقل کرتا ہے۔ اس کا توانا اور تیکھا اسلوب نگارش اس کی اپنی ٹکسال کا ڈھلا ہوا سکہ ہے جس پر اس کے نام کی مہر کندہ ہوتی ہے۔ تخلیق، ترتیب کے عمل میں، وہ قدم قدم پر، اپنی روح کی آگ اور اپنی نگاہ کے حسن کو

کچھ اس فن کاری سے ہم آہنگ کرتا ہے کہ اس کے الفاظ شعلۂ گل کی طرح دمک اٹھتے ہیں۔ اس کی نثر پنجاب کے دیہات کی ان صحت مند سڈول سندریوں کی طرح ہے جو گھٹنوں سے بھرے ہوئے دو، دو گھڑے سر پر رکھ کر ہنستی، بولتی، اٹھکیلیاں کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے فن کا موضوع، زندگی ہے۔ زندگی کی محرومیاں، تلخیاں خوبیاں اور برائیاں بھی کچھ۔ صناعی اور نقطۂ نگاہ کی آنچ نے اس کی تحریروں کو بیک وقت عظمت و دلبری کا ایک مہتابی بنا دیا ہے۔ وہ اردو ادب میں موتیوں کا سوداگر ہے۔ مگر ادب میں جتنا اس کا مرتبہ ہے، اتنی اس کی شہرت نہیں ہے، شہرت فی زمانہ آتی نہیں، لائی جاتی ہے۔ یہ ایک الگ ہنر ہے جو عزیز ملک کو نہیں آتا ؎

آنچہ بر شیخ حلال است حرام است اینجا (گرامی)

وہ کتاب سوچنا اور لکھنا جانتا ہے مسودے کے ناک نقشے کو "موتی بند کر کے" اس کی اشاعت کی تمت تک مستعد رہتا ہے۔ مگر جب کتاب کے بندھے ہوئے بنڈل اس کے حجرے میں آکر انبار ہو جاتے ہیں تو پھر ؎

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے۔

عزیز ملک سے میری دوستی بے خبری میں شروع ہوئی۔ یہ ہوتا بھی پہلی نگاہ کا سودا ہے یہ ۱۹۲۵ یا شاید ۱۹۲۶ء کی بات تھی میں گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں اور عزیز ملک گارڈن کالج راولپنڈی میں پڑھتا تھا۔ انہی دنوں ہمارے ایک مشترکہ شاعر دوست بشیر اثر کی شادی ہوئی تو اس تقریب پر دوستوں کی جو منڈلی چکوال میں جمع ہوئی۔ ہم دونوں پہلی مرتبہ وہیں ایک دوسرے سے ملے۔ عزیز ملک، اس وقت سُرخ و سپید، شوخ و شنگ نوجوان تھا۔ پھرتیلا ہنسوڑ، جگت باز، چست جامہ۔ رگ رگ میں شرارت کی بجلیاں بھری ہوئیں۔ ایک دوسرے کی لکھی ہوئی اردو تو ہم نے بہت بعد میں جاکر دیکھی اور پڑھی البتہ اُردو بولنے میں عزیز ملک کا لب و لہجہ اس وقت بھی سطح مرتفع پوٹھوار سے بلند معلوم ہوا۔ اب تو خیر

ایک مدت سے وہ اپنی نثر کی لطافت اور لہجے کی کھنک سے ادبی مجالس کو مشاعروں کی طرح لوٹ
لیتا ہے لیکن ان دنوں بھی جی چاہا کرتا کہ وہ بولتا جائے، ہم سنتے جائیں۔ الفاظ ایک
ناقص ذریعۂ ابلاغ ہیں۔ مگر وہ اس ناقص وسیلے کو بڑے کامل طریق پر استعمال کرتا۔
نالہ سواں کے کنارے پلے بڑھے اس لڑکے کو جمنا اور گنگا میں دُھلی ہوئی اُردو بولتے
دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی۔ اُردو اس کے اندر اُگی ہوئی معلوم ہوتی ان دنوں وہ شاعر بھی
تھا۔ مگر یہ ڈالی جلد ہی ٹوٹ گئی۔ شادی کی تقریب تو وہ ایک روز رہی، مگر دستور
کی منڈلی چار دن بشیر اثر کے چارے پر سے نہ اتری۔ دولہا میاں اب دن میں کسی
کسی وقت ہی ہمارے ہاتھ آتے، مگر جب ہاتھ آتے تو عزیز ملک اس کی نوعروسی پر ایسے
کشتہ طراز نوکیلے فقرے چست کرتا کہ وہ اپنی طبع کی براقی اور اندازِ کلم کی جنابندی
سے ہماری محفلوں کی جان بن گیا۔

ہماری دوسری ملاقات راولپنڈی میں اس کے مکان پہ ہوئی۔ آج کا حجرہ شاہ مقیم
ان دنوں ایک باقاعدہ سجے ہوئے "مہمان خانے" کی حیثیت رکھتا تھا۔ کنبے کا کل طول و
عرض والد والدہ اور عزیز ملک۔ دولت کی ریل پیل تو نہ تھی۔ مگر عزیز ملک کے چاؤ چونچلے
کے واسطے بہت کچھ تھا بہترین کالج۔ بہترین لباس۔ کتابیں کم۔ ٹینس کھیلنے کے ریکیٹ اور ولا
بوٹوں کے جوڑے اور ایڈ ورڈ روڈ کے ٹیلر ماسٹروں کی سلی ہوئی پتلونیں زیادہ بچے کم خوشحال گھرا
عزیز ملک کے والد نامور طبیب اور ممتاز شہری تھے۔ ان کی طبیعت میں شگفتگی کی ایک
ایسی لہر ملتی تھی جو طب کے کوچے سے شاذ شاذ گزرتی ہے۔ سخن فہم، سخن دوست۔ مطب
پہ مریضوں کا ہجوم تو بہت رہتا، مگر حکیم صاحب کی طبیعت کے انداز سے لگتا تھا جیسے مطب
انھوں نے آمدنی کے لیے نہیں، خرچ کے لیے کھول رکھا تھا نادار مریضوں کو دوا اپنی
گرہ سے دیتے اور بیشتر ہجوم انہی مریضوں کا ہوتا۔ ہاں تیسرے چوتھے مہینے بڑو دا
یا گوالیار کا مہاراجہ بیمار ہو جاتا تو ایک ہی نسخے سے دو تین برس کا "مطب" نکال لیتے

ام پاکستان کے بعد جب اکثر والیانِ ریاست ہندوستان میں رہ گئے اور پاکستان کے والیانِ یاست نے مسند پہ بیٹھنا چھوڑ دیا، تو حکیم صاحب کی معیشت مضطرب ہو گئی۔ تاہم دیوارِ ستان پہ کچھ کچھ دھوپ آخر دم تک چھٹکی رہی عربی فارسی کے منتہی عالم تھے۔ گفتگو ہمیشہ ٹیٹھ پنجابی میں کرتے عزیز ملک کے دادا بھی جید عالم دین تھے۔ قرآن کریم کا پنجابی جمہ انہیں کا کارنامہ ہے۔

گارڈن کالج کے اسٹوڈنٹ عزیز ملک کے ماحول اور مشاغل سے بظاہر یہی علوم ہوتا تھا کہ وہ تحصیلداری کی طرف جا رہا تھا۔ مگر جب اگلی دفعہ ملاقات ہوئی تو دیکھا انگریزی وضع کے کپڑے تہہ کر کے، شیروانی اور پاجامے میں ڈھلے، سر سے پا تک یم ملک عبدالعزیز بنے ہوئے بوہڑ بازار میں اپنا علیحدہ مطب کھولے بیٹھے ہیں۔ اس ور میں ہم جب بھی ان کے مطب پر گئے، وہ بازار سے پھل منگوا کر، اور اپنے مرتبانوں ے لذیذ یاقوتیاں نکال نکال کر ہماری خوب خوب تواضع فرماتے۔ عزیز ملک کو اپنے صدری نخوں پر بڑا اعتماد اور فخر تھا۔ اسی بوتے پر انھوں نے اتنا بڑا دواخانہ کھول لیا تھا جب اس کو بند کرنا پڑا تو تین مہینے اس کو بند کرنے میں لگے۔ اور اگلے تین مہینے تک ارا بوہڑ بازار معجون، مشروبات کی خوشبویات سے معطر رہا۔ ان کی دوائیں تو دوسروں کے ے لیے سازگار تھیں مگر دواخانہ ان کے اپنے لیے "ناساز" رہا۔

حکیم ملک عبدالعزیز کے مطب کے ناسرسبز رہنے کی بنیادی وجہ تو یہ تھی۔ کہ حکیم صاحب ب سے زیادہ ادب کی پریکٹس کرتے تھے۔ یعنی دواساز ازل کو منظور ہی نہ تھا کہ ان کا دواخانہ چلنے پائے ایک الجھن یہ بھی تھی کہ حکیم ملک عبدالعزیز آسان زبان نہیں بولتے تھے ور طبِ یونانی کے خوگر مقامی مریض مشکل گو طبیب کے پاس جاتے ہوئے کتراتے تھے۔ کہ ہ معلوم حکیم صاحب کیا سمجھائیں اور ہم کیا سمجھیں۔ پھر ان کا مطب۔ کیا بہ لحاظ وسعت و رتیب، اور کیا بہ اعتبار ادویہ کی پیرہن گستری اور بوتلوں کی گردن آرائی —— مغربی

شیشہ بندی کے نمونے پر اس ٹھاٹھ باٹھ سے آراستہ تھا، کہ عام مریض اس کے اندر قدم رکھتے گھبراتا کہ نہ جانے کتنا قیمتی نسخہ مل جائے، عزیز ملک کو نہ اپنی دوا پیچنی آئی، نہ کتاب۔ مطب بند ہوا تو ملازمت کی تلاش ہوئی۔ محاسبِ اعلیٰ دفاع کے محکمہ میں سینگ سمائے دوسری عالم گیر جنگ کے دوران میں، پونا، کرکی، شملے وغیرہ میں قیام رہا۔ قیام پاکستان کے بعد سے اپنے "حجرہ شاہ مقیم" میں مقیم ہیں۔ ملازمت میں مطب سے بھی زیادہ کبیدہ خاطر رہے مگر چونکہ پاؤں میں عیال داری کی بیڑیاں بڑھتی جا رہی تھیں، لہٰذا، کوئی تیس برس اس جال میں پھڑ پھڑاتے رہے۔ سرکاری کارندہ اپنے حلف کی رُو سے چوبیس گھنٹے کا ملازم ہوتا ہے۔ پھر عزیز ملک کا دفتر کچھ خصوصی قماش اس طرز کی رکھتا تھا کہ کرسی کے سامنے ہی نہیں، اس کے ذہن کے اندر بھی دفتر ہی لگا رہتا۔ غالب نے اپنے گھر کے احوال میں لکھا تھا کہ مینہ ایک گھنٹہ برستا ہے۔ تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ عزیز ملک کے دفتر میں اس کی جسمانی مشقت اگر ایک گھنٹے کی ہوتی تو ذہنی مصروفیت چار گھنٹے ٹپ ٹپاتی رہتی ناکردہ خطاؤں کو ماننے کی اذیت مستزاد، یہ اس کی ادب سے سچی لگن کا معجزہ ہے۔ کہ اس نے قلم اور قرطاس کا ساتھ کسی حال میں نہ چھوڑا۔ میرا اندازہ ہے کہ عزیز ملک نے اپنی زندگی کا غالب حصہ اپنے حجرے کے اندر گزارا ہے اور جاگ کر گزارا ہے۔ ادب کی تپسیا میں وہ عمر بھر آتش دیدہ گیلی لکڑی کی طرح جلتا رہا ہے ـــــــ تب نظر آئی ہے اک مصرع تر کی صورت۔ !

میں پہلے عرض کر چکا، عزیز ملک سے میری دوستی بے خبری کے عالم میں شروع ہوئی یہ زندگی کے اس دور کی عطا ہے جب کوئی منظر گدلا نہیں ہوتا، اور انسان اپنے اجلے ضمیر اور لڑکپن کے خلوص کی مشعلیں لے کر دوستی کے مشن پر نکل پڑتا ہے۔ میں اس اتفاق کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ کہ بے خبری ہی بے خبری میں، ہماری دوستی پکی بھی ہو گئی۔ اور جب ہم ایک دوسرے کی سمجھ میں آئے تو اس مقام پر پہنچ چکے تھے۔ جہاں دوستی کے رشتے کو تر و تازہ رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے ملاقات یا گفتگو بھی لازمی نہیں رہتی۔ عزیز ملک اور میں چالیس برس

سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ کئی مرتبہ زندگی ہمیں مختلف سمتوں کو مڑتی ہوئی، لمبی لمبی، تاریک گلیوں میں بھی لے گئی۔ بعض اوقات اس طرح اوجھل ہوئے کہ لگتا تھا اب شاید سوکھے ہوئے پتوں کی طرح کتابوں ہی میں ملیں گے۔ رُوٹھے بھی ہوں گے مگر ٹوٹے کبھی نہیں۔ مجھے ہمیشہ ایسا لگا جیسے وہ یہیں کہیں میرے قریب کھڑا ہے اور یہ کہ اگر وہ میرے قریب نہ ہوتا تو میری تنہائی مجھ پہ کتنی بھاری ہو جاتی ——— عزیز ملک کو سمجھنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس سے دوستی کوئی آسان کام نہیں۔ اس کا خلوص آدمی کو حیران کیا بدحواس کر دیتا ہے ———

جس کو ہوں جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں!

بے غرضی کا یہ عالم کہ دوست خود ہی سونگھ سانگھ کر ان کے کسی کام آجائے تو آجائے۔ ورنہ وہ صلہ و ستائش کی کوئی توقع نہیں رکھتا۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ

"جس نے بغیر حاجت کے سوال کیا اس نے آگ کے انگارے کھائے"

عزیز ملک اس قول پہ بڑی سختی سے عمل کرتا ہے۔ بلکہ اس نے تو اپنی حاجتوں کو بھی محدود کر لیا ہے وہ زندہ رہنے کا شوق تو رکھتا ہے، مگر اپنی شرائط پہ۔ اس کی معیت میں اگرچہ وقت بڑا چونچال گزرتا ہے۔ مگر وہ دوستی کو محض خوش وقتی نہیں سمجھتا وہ دوستی عبادت کی سطح پہ کرتا ہے۔ محبت کے ساحل پہ قدم رکھتا ہے تو واپسی کی کشتی کو جلا دیتا ہے۔ اپنے گھر بار کی خبر گیری کے لیے اس کے پاس کبھی وقت نہیں ہوا۔ مگر اپنے دوستوں کے گھروں میں، پرسشِ احوال کے پھیروں میں ناغہ نہیں ہونے دیتا۔ جس اتوار کو میرے گھر میں صبح ۶ بجے گھنٹی بجے، میں سمجھ جاتا ہوں۔ عزیز آگیا اور کون ہو گا جو اتنے تڑکے تڑکے چار میل پیدل چل کر آجائے۔

مگر ہاں۔ توہین کو وہ بے تکلفی یا غلط فہمی کے حوالے سے بھی برداشت نہیں کرتا اور ثمّ ہاں یہ کہ اس کی طبیعت کے اندرونی حاشیے پہ جلالی رنگ کی جو ایک چنگاری سی تڑپتی رہتی

ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ وہ کب ذرا سی ہوا لگنے پر شعلہ سا بھڑک اٹھے۔ اس کے بے پایاں افق پر جتنا پیار آتا ہے۔ اس کی بیباک حق گوئی سے اتنا ڈر بھی لگتا ہے۔ اس نے اپنی ضروریات کو اسی لیے تو محدود کر لیا ہے کہ اس کی خودداری پر آنچ نہ آنے پائے۔

عزیز ملک پختہ ذہن، پختہ قلم شخص ہے وضعداری میں بھی پختہ رنگ۔ اس کو اس کی جبری مصروفیات سے الگ کر کے دیکھا جائے تو وہ یا تو اپنے حجرے میں کتابوں کے محاصرے میں ملے گا۔ یا کسی سڑک پر پیدل چلتا۔ کسی دوست کے گھر جاتا ہوا — یا چھاؤنی کے باغ میں پلازہ سینما کی چوٹ پر بیٹھ کر نماز مغرب ادا کرتا ہوا۔ بارہ چودہ برس تک شام کے وقت دو ڈیڑھ گھنٹے کی مجلس آرائی ہمارا معمول رہا۔ مجلس آرائی کیا تھی۔ بازار میں "چکھوتی گشت" کی ایک صورت تھی۔ تھوڑا کھانا، زیادہ چھپانا۔ زندگی کو نئی نئی سطحوں سے دیکھنے کا بہانہ۔ تقریب بہر ملاقات۔ مرحوم دوستوں میں سے نذیر احمد شیخ، عبدالعزیز فطرت، ڈاکٹر گذان اور پروفیسر رضی صدیقی حلقے کے بنیادی رکن تھے۔ استاد یوسف ظفر اور ابوصالح اصلاحی کبھی کبھی آ ملتے۔ کراچی سے جناب اے ڈی اظہر اور جناب ممتاز حسن احسن تشریف لاتے تو وہ بھی شامل ہو جاتے۔ ہائے، ہائے

داغ فرقت دے گیا ہے کیسا کیسا آشنا!

اس حلقے کے باقیات میں سے (اللہ ان کو دیر تک سلامت رکھے) عزیز ملک بریگیڈیر گلزار احمد، کرنل جاوید خٹک، اور شاعر کہسار، پروفیسر کرم حیدری بفضل تعالےٰ زندہ ہیں۔ مگر "چکھوتی گشت" کی رسم شیخ دوراں (نذیر شیخ) کے اٹھ جانے پر اٹھ گئی — بہر حال — جب تک یہ التزام رہا۔ احباب کی صحت کا پورٹ فولیو عزیز ملک کے سپرد رہا۔ کیا چیز کھائی جائے، کیا نہ کھائی جائے۔ اس کا فیصلہ موسم اور طبیعت کی مناسبت سے وہی کیا کرتے۔ کم از کم نیک و بد تو سمجھا دیتے۔ خود چلائے کے کوپ کے سوا بازار کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتے۔ کسی لفظ کی "سنبن قاف" میں کسی دوست کو شبہ ہوا۔ تو تلفظ کا مخرج انہیں سے درست کرایا

جاتا۔ جس مسئلے پر بھی ان سے استصواب کیا گیا، ان کی بے کم و کاست رائے، بے جھجک بیجھے، دو ٹوک الفاظ میں وہیں کی وہیں سن لو۔ بے شک کوئی خوش ہو یا ناخوش ——— ابہام نہ ان کے ادب میں ہے نہ زندگی میں نازک سے نازک مقامات پر ایسے ایسے خوفناک سچ بول جاتا ہے کہ بایدوشاید حق گوئی کا یہ لپکا بعض اوقات طنزِ تلخ کی صورت بھی اختیار کر جاتا ہے ؎

مگر حفیظؔ کو یہ بات کون سمجھائے

میں جب کبھی ان کے گھر جاتا ہوں تو برقی گھنٹی کا بٹن دبانے کے بجائے بآوازِ بلند یہ نعرہ لگاتا ہوں۔

"اَلحقُّ مُرٌّ"

وہ گھر میں ہوں تو اندر سے پکارتے ہیں۔ "اَلحقُّ مُرٌّ"

کئی برس کی بات ہے۔ ان کی بیٹی طاہرہ سلمہا تعالیٰ جواب ماشاءاللہ ایم اے پاس کر کے بڑی سگھڑ بی بی بنی ہوئی ہے، ان دنوں دوسری یا تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ ایک روز میں نے ان کے ہاں حسبِ معمول "اَلحقُّ مُرٌّ" کا نعرہ لگایا تو طاہرہ باہر آئی اور اس نے مجھ سے پوچھا ——— "چاچاجی تسیں ایہہ کی کہندے او"

میں نے جب اس کو "اَلحقُّ مُرٌّ" کے معنی بتائے تو طاہرہ کھل کھلا کر ہنسی اور "امّی امّی" کہتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ نہ معلوم اس نے امّی کو جا کر کیا بتایا۔

طلسمی مُنڈری والی کتاب

صدیق سالک میرا دوست ہے۔ دوستی کا ایک ناتا یہ بھی ہے کہ اس کے گاؤں کا نام منگلیہ ہے، اور میرا گاؤں منگلا بند کی سرنگ نمبر ۲ کے سامنے واقع ہے۔

عربی شاعری میں، دوست کو جام شراب اور ریگیتوں کی کتاب سے بھی تشبیہہ دی گئی کہاں دی گئی ہے یہ جناب ممتاز حسن صاحب کو معلوم ہے صدیق سالک کو ہم نے مسکراہٹوں کی کتاب پایا۔

سالک سے اپنی پہلی ملاقات کی ہمیں دو چیزیں ہی یاد رہ گئی ہیں۔ بلند و بالا قامت اور دلنواز مسکراہٹ۔ یا وہ کھردرہ پن جو د سادر کی عورتوں میں زیادہ مقبول ہے۔

یہ مسکراہٹ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھی اس کے ہونٹوں پہ دیکھی..... سقوطِ ڈھاکہ سے کچھ پہلے بنگال کے جلتے بجھتے شب و روز میں بھی دیکھی...... قید سے اس کے خطوط بھی مسکراتے ہوئے ملے، اور اب اس کی کتاب کو بھی مسکراتی ہوئی کتاب پایا۔

وہ کوئی ہوائی جہاز کی ساخت کا آدمی نہیں کہ بیرونی ہوا کا دباؤ اندر کی فضا پر اور اندر کا ہیجان باہر کی فضا پر اثر انداز نہ ہو سکے، یہ ظرف اور حوصلے کی بات ہے، خدا جس کو بخش دے۔ اب تو خیر برسوں کی بہ جکنی چپڑی استری شدہ شہری زندگی نے اس کے چہرے پر ہلکا سا "پوچا" اردو شاعری کا بھی پھیر دیا ہے مگر جب وہ تازہ تازہ گاؤں کے کھیتوں سے کٹ کر، جنرل موتی کے ہیڈ کوارٹر میں وارد ہوا تھا تو سنگِ موتی ہی کا کوئی مجسمہ معلوم ہوتا تھا مگر مسکراتا ہوا مجسمہ۔ کشادہ دست د کشادہ جبیں۔ سر سے پاؤں تک تین انچ سپاہی (ٹوٹل ۷۲ انچ) ہو بہو ویسا ہی جیسے فرنٹیئر فورس، یا ہماری دوسری رجمنٹوں، رسالوں، عسکری

شعبوں کے، فولادی ٹوپی پہن کر پوچ (POUCH) میں ریوالور اڑس کر، سینہ تان کر چلنے والے گبھرو ہوتے ہیں۔

فوج کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ میں کیپٹن صدیق سالک سے جب ہماری ملاقات ہوئی تو وہ فوج میں داخل ہو رہا تھا، اور ہم نکل رہے تھے۔ ہمارے اور اس کے درمیان فوجیوں کی ایک پوری نسل، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک طویل جنگِ عالم گیر، آٹھ دس انگریز کرنیل جرنیل اور بہت سی خچریں حائل تھیں۔

دوسری عالم گیر جنگ میں ہم لوگوں نے کرنل مجید ملک، لیفٹیننٹ کرنل فیض احمد فیضؔ اور بالخصوص اُردو زبان کے یگانہ روزگار ادیب مولانا میجر چراغ حسن حسرتؔ کی سرکردگی میں، خاصے لانگ مارچ "کے بعد، باوردی صحافیوں، ادیبوں کے اس محکمہ کی چولوں کو اردو شاعری کی فضا میں اچھا خاصہ فٹ کر لیا تھا۔ مگر اب جو سالک کی طرح کے بظاہر ایڑی سے ایڑی بجانے والے اور پنجوں کے بل" بھمیری" کی طرح گھومنے والے فوجی جوان کو دیکھا، تو ماتھا ٹھنکا کہ یہ لوگ اس محکمے کو پھر فولادی ٹوپی پہنا دیں گے۔ مگر قیس جب تصویر کے پردے سے مکمل برآمد ہوا تو ہمارے فاضل دوست عبدالعزیز خالد کے الفاظ میں کتابوں کا "معین دمعاد اور حمید و ندیم"۔ نکلا وہ اُردو کا ایک شگفتہ رقم ادیب تھا۔ انگریزی اس کی معاش تھی۔ اُردو پیاس اور پنجابی اساس۔ اس کے نکاہی مضامین، ادبی حلقوں کو چونکا رہے تھے، اس کی ظرافت توپ والی گرجتی، گمکارتی چیز نہ تھی۔ ایک نوع کی ذہنی بشاشت تھی۔ پھولدار جھاڑیوں میں، جیسے ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی تک، اڑتی رنگین چڑیاں نہیں ہوتیں، بس ویسی ہی ہلکی، چہچہاتی سی ظرافت طنز میں بھی لکڑی کا پتلا برادہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تاکہ ضرب تو لگے مگر زخم نہ آنے پائے۔ لکھنے کا اسلوب ہے خود آگے آگے اور موضوع پیچھے پیچھے بعض اوقات خود اتنے آگے نکل جاتے ہیں کہ کسی نقطے پر" اباوٹ ٹرن " (ABOUT TURN) ہو کر موضوع کو" بگل" بجا کر بلانا پڑتا ہے کہ سے آواز دے کہاں ہے؟

مجموعی طور پر سالک کا مزاح بشاشت کی ایک ایسی کیفیت کا نام ہے۔ جو مسرت و محبت عالی حوصلگی اور دردمندی کی "فیملی پلاننگ" سے پیدا ہوتا ہے۔

"ہمہ یاراں دوزخ" میں سالک کے اسلوبِ تحریر کی ان خصوصیات کا پہلے سے کہیں زیادہ دم پخت مارالمم رواں دواں نظر آتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی سنگین حکایت شب کو ایسے شگفتہ لہجے میں لکھ گیا ہے کہ جیسے دوزخ کا سفر بہشت کے گائیڈ کی معرفت طے ہو رہا ہو۔ سالک نے جس انداز میں یہ کتاب لکھی میرے خیال میں وہ اس کے موضوع کے لیے موزوں نہ تھا۔ مگر کتاب پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اسی انداز نے تو جسم واقعہ میں جان ڈال دی ہے شگفتگی سالک کی شخصیت کا جزو ہے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہم تو آگرہ کیمپ کے میجر گلاب سنگھ کی طرح "ہلا شیری" کرنے والوں میں سے تھے، صفِ اوّل کی ڈیوٹی عموماً کیپٹن صدیق سالک یا ہمارے دوسرے نوجوان رفقا ہی انجام دیتے تھے۔

یہ جنگ، ہم دوسری جنگِ عظیم کے آزمودہ کاروں کے واسطے بھی، نئی جنگ تھی یہ اندازہ پہلی مرتبہ اسی جنگ سے ہوا کہ، اپنی سرزمین پر، اپنی جنگ کیا معنی رکھتی ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں تو بعض "تھیٹروں" (THEATERS.) میں مہینوں یہی پتہ نہ چلتا کہ لڑائی اصل میں ہو کہاں رہی تھی؟ محاذ طرابلس میں، کیمپ دیولالی میں۔ سپاہی ہانگ کانگ میں اور خود حضرت چرچل مدظلہ العالی لندن میں۔

اپنی جنگ کے شعلے تو ہمارے گھروں، ہماری منڈیروں پہ لپک رہے تھے اس کی مٹی تو اڑ اڑ کر، ہماری ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی مانگوں میں پڑ رہی تھی۔

اس جنگ کا نتیجہ تو اخباروں کے علاوہ ہمارے ماتھوں پر بھی چھپنا تھا۔ یہی احساس تھا کہ ؎

شعلۂ محمود از خاکِ ایاز آید بروں

ہمارے محاذ، ہماری دہلیز پر ہی تو تھے۔ کیپٹن سالک کو جب دیکھا۔ صحافیوں کی محاذ بھائے انگریزوں اور فرانسیسیوں سے پنجابی میں انگریزی بولتا۔ محاذ کو جاتا یا محاذ سے آتا، وہ ان لوگوں میں سے تھا۔ جو واقعات کے عین درمیان رہتے ہیں۔ اور بحران کے زمانے میں جب کوئی "مشن" ان کے سپرد کیا جاتا ہے تو وہ "مشن" کو سینگوں سے جا پکڑتے ہیں۔ سالک کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی پیشانی کو ہمیشہ خنداں پایا۔ محاذ سے آتا تو خبروں کے علاوہ چٹکلوں کا تھیلا بھی بھر لاتا ورنہ جنگ میں چڑچڑا پن آدمی کی ناک پر رکھا رہتا ہے۔ سقوطِ سنگاپور کے بارے میں، کہ ستر، اسی ہزار اتحادی فوج نے وہاں ہتھیار ڈالے تھے، ہم نے یہ لنگر گپ سنی تھی۔ کہ جنرل پرسیول اور جنرل ہیتھ اتنے چڑچڑے ہو گئے تھے کہ جاپانیوں سے لڑنے کے بجائے ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔

سالک نے یہ کتاب ابواب باندھ کر لکھی ہے۔ اسی طرح زندگی میں بھی وہ "ٹارگٹ" کے بعد "ٹارگٹ" طے کرتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ بس ایک شاعری کا اونٹ ابھی تک کسی کروٹ نہیں بیٹھ سکا۔ محمد صدیق نے غالباً نوجوانی کی کسی رومانی ترنگ کے زیر اثر، یا انتہائے شوق کی گھبراہٹ میں یا یونہی از راہِ احتیاط تخلص رکھ لیا تھا کہ

آزاد شاعری وہ کر سکتا ہے مگر "شارٹ کٹ" کا وہ قائل نہیں ہوتا تو سقوطِ ڈھاکہ کے مرحلے پر جب سقوط سے پہلے پرواز کی صورت نکل آئی تھی۔ یا بعد میں ایک مہربان و محب بنگالی خاندان نے ان کو اپنے ہاں خانہ نشینی کی پیش کش کر دی تھی، کہ یہاں مزے سے میٹھے رس گلے کھاتے رہیے۔ تو آپ قید و بند کا گرم سرد چکھنے کا فیصلہ نہ کرتے۔ مگر ؎

دار و رسن تعلقِ خاطر کی بات ہے
ورنہ قریب تر تھا شبستاں کھلا ہوا

کل کی خبر نہیں۔ مگر آج تک تو وہ شاعر نہیں بن رہا۔ البتہ تخلص کو اس نے بالکل بنجر بھی نہیں رہنے دیا۔ جو شخص ایسی شاداب نثر لکھتا ہو، میں سمجھتا ہوں کہ اس کو تخلص رکھنے کا حق مل جانا چاہیے ویسے شعروں کی "ذخیرہ اندوزی" کا اسے پرانا لپکا تھا، مشرقی پاکستان میں جاکر تو یہ شوق بجائے خود ایک ٹارگٹ بن گیا۔ راولپنڈی میں شفیق الرحمٰن اور مشتاق احمد یوسفی ان کے تکیے کے نیچے رہتے، ڈھاکہ میں غالبؔ اور فیضؔ کو اس کے پہلو میں پایا۔ حجامت بھی "زنداں نامے" میں کھڑے ہو کر بناتے۔

سالکؔ کا پہلا خط اُردو کے ایک پہلے گھوارے فورٹ ولیم سے ملا۔ پھر اس کے خط آگرہ کیمپ ۴۸ سے آنے لگے۔ جنگی قیدی خطوں میں لفظوں کے ہزار طوطے، مینا بنائیں تھوڑے بندھتی تھی۔ تاہم سالکؔ جن بانکے ادبی کنایوں میں "شادیِ غم دیدگاں کا نقشہ کھینچتا اس میں اس کی ذہنی بشاشت کی غنچہ در آویزی صاف جھلکتی تھی۔ خطوط میں "لائیں" مارتے ہوئے شعروں کا استعمال اتنا بڑھ گیا تھا کہ بعض خطوط میں تو نذیر احمد شیخ کے بقول

؎ اشعار کی بھرمار تھی احوال ندارد

سقوطِ ڈھاکہ قیامت کا سانحہ تھا، دوسری عالمگیر جنگ میں ہم نے کئی قیدی کیمپ دیکھے ہیں۔ کلیان کیمپ میں اطالوی قیدیوں کا پورا لشکر ہمارے پڑوس میں پڑا تھا۔ ان کی نفری کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اٹلی میں ڈونٹے اور مارشل گریزیانی ہی رہ گئے ہوں گے۔ بہرحال ان کی بارکیں ہماری بارکوں جیسی ہی تھیں۔ غسل خانے ہم سے اچھے، راشن چوکھا۔ سینے پر کوئی خاردار تار بھی منڈھی ہوئی نہ ملی۔ وہ کیمپ کے شاداب کھلے میدان میں مرغابیوں کی طرح گھومتے رہتے۔ مگر اس کے باوجود، ایسا لگتا تھا کہ روشنی ان کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے بجھ گئی تھی۔

دشمن کی قید محض بھی روح فرسا ہوتی ہے بھارت کی قید تو راکھششوں کی قید تھی وہ تو ہماری روح کچلنا چاہتا تھا۔ اس کی تو کوشش تھی کہ ہم کبھی سر اٹھا کر نہ چل سکیں —

——— ہمیں یقین تھا کہ جنگی اسیروں میں سے، سول کے پلڑے سے مسعود مفتی اور فوج کے "کوٹے" سے میجر صدیق سالک ضرور کتابیں لکھیں گے۔ یہ دونوں تو خیر، ٹیلی ویژن کے مذاکروں کی زبان میں، ہمارے ملک کے جانے پہچانے دانشور ہیں، اس بات کی توقع رکھنی چاہیے کہ ہمارے ان سابقہ "شاہانِ بے کمر اور خسروانِ بے کلاہ" میں سے کئی نئے شمس و قمر طلوع ہو کر فکر و فن کی راہوں کو روشن کریں گے۔ دلوں کا یہ اتھاہ درد زبان پر آ کر ہی رہے گا۔ "ہمہ یاراں دوزخ" اسی موجِ درد کی پہلی لہر ہے۔

سوچ کا کارواں رکا نہ کبھی

ہم جہاں بھی رہے سفر میں رہے

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد دیوانوں پہ کیا گزری۔ ایک بہت وسیع۔ نہایت نازک اور بڑا پیچیدہ موضوع ہے۔ یہ تاریک راہوں میں مرنے اور مارنے والوں کی کہانی ہے: سالک کی مشکل یہ ہے کہ وہ جانتا زیادہ ہے اور بتاتا کم ہے ——— بہت سا مال اس نے الگ باندھ کر رکھ چھوڑا ہے۔ فوجی اور سیاسی مباحث کو میجر صاحب نے پیش لفظ میں ہی چونے کی لکیر کھینچ کر، اپنے لیے "آؤٹ آف باؤنڈ" کر لیا ہے۔ یوں بھی المیہ اتنا وسیع اور اس قدر تازہ ہو، اور اس کے عسکری، تاریخی اور نفسیاتی دھاگے اتنے نازک اور اتنے الجھے ہوئے ہوں تو اتنی اور اس انداز کی کتاب میں بہت سے گوشوں کا تشنہ رہ جانا لازمی تھا، اسے سالک کی تخلیقی اور تنظیمی صلاحیت کا کمال سمجھنا چاہیے کہ ان اوراق میں المیے کا ایک خاصا کشادہ "ایریل ویو" (AIRIAL VIEW) نگاہوں کے سامنے کھل جاتا ہے یا سالک کا آرٹ یہ ہے کہ وہ دال کی کڑچھی ڈالتے ڈالتے، چٹکی چٹکی مسالہ، اونچے اونچے اور گہرے گہرے مسئلوں پہ بھی ڈال جاتا ہے۔ کتاب کی بڑائی، اور اس کی سندرتا، چھوٹے چھوٹے واقعات سے ابھرتی ہے۔ سالک واقعات کے چھوٹے چھوٹے محدب، شیشے کاٹ کر ایک فریم میں جوڑتا چلا گیا ہے۔ "ہمہ یاراں دوزخ" زخم تو مندمل بھی ہو جاتے ہیں۔ کہیں کہیں

پاسپورٹ" کا کام بھی دے جاتے ہیں مگر روح کا گھاؤ بھرنے میں نہیں آتا ؎

کوئی پروانوں کو بتلاؤ کہ جلنے کے سوا
اور بھی چند مقاماتِ وفا ہوتے ہیں

بھارت' زمین اور ذہن، دونوں محاذوں پر ٹینک کے بجائے پروفیسر مجیب اور توپ کی جگہ انفارمیشن سیکرٹری قدوائی اور اسی کاٹ کا دوسرا "لکھا پڑھا اسلحہ" استعمال کرتا رہا گولہ بارود کے محاذ پر تو جنگ اسی لمحے ختم ہو گئی تھی جب ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی ڈھلتی ہوئی سہ پہر کو، ڈھاکہ کے رمنا ریس کورس میں پاکستان کے جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی نے اپنا ریوالور بھارت کے جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے حوالے کر دیا تھا۔ ہمارے جنگی قیدی اعصاب کی یہ شدید جنگ مسلسل دو برس تک، بھارت کے بندی خانوں میں لڑتے رہے اور اس شان سے لڑتے رہے کہ زمین پر ہاری ہوئی بازی ذہن کے محاذ پر جیت کر وطن واپس آئے ــــ اس کتاب کو، کیمپ نمبر ۴۴ کے حوالے سے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے اس خاموش محاذ کی "فرنٹ لائن ڈسپیچ" (FRONT LINE DISPATCH.) سمجھنا چاہیے۔

قید کی زندگی کا مختلف پرتوں میں، انفرادی یا اجتماعی تجزیہ کرنا ایک قسم کا دستاویزی عمل ہے اس عمل میں خود اپنے اوپر بھی "چاند ماری" کرنی پڑتی ہے۔ قید کے لمحات کو ابھی وقت کی چھلنی سے بھی گزرنا ہے۔ سالک نے نفسیاتی کش مکش کے پہلوؤں کو نہ صرف یہ کہ بطورِ خاص اپنا مرکزِ نگاہ بنایا ہے بلکہ احساسات کو جذبات سے الگ ہو کر پرکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس نے کمزوریوں اور خوبیوں کو چھاج میں پھٹک کر ان کے الگ الگ "تو بل" نہیں لگائے لیکن خود احتسابی کی ایک رَو میں، سوالات کی "پوری نمبری" ابھرتی چلی گئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب تاریخ کے ایک المیے کے سائے میں سوچی اور لکھی گئی ہے۔ مگر مصنف نے کمال بالغ نظری سے روشنی کے ان دروازوں کو کھلا رکھا ہے جن سے مستقبل کی دھوپ چھن کر اندر آ رہی ہے۔ ہر کتاب میں ایک

طلسمی مندری" ہوتی ہے۔ جس میں جھانکے بغیر آپ کتاب کی روح میں نہیں جھانک سکتے۔ اس کتاب کی "طلسمی مندری" اس کے محدّب شیشے ہیں۔ اگر آپ ان میں سے نشست باندھ کر دیکھیں گے تو آپ بہت کچھ دیکھ لیں گے۔ آندھیاں اور طوفان بھی۔ چہرے اور کردار بھی۔ اسیروں کے چہرے۔ صیادوں کے چہرے۔ ہمارے تمہارے میر صاحب۔ سب خواتین و حضرات کے چہرے۔ ان واقعات نے کتاب کو اتنا متحرک اور زندہ بنا دیا ہے کہ سالک کے ہمراہ قاری خود بھی کیمپ نمبر ۴۴ کی چٹائی پر جا بیٹھتا ہے اور جب میجر راٹھور ٹوکری کی گھات کھڑی کر کے فاختائیں پکڑتا ہے تو ڈوری کے ساتھ ساتھ قاری کا دل بھی ہلنے لگتا ہے۔ سالک کا قلم، قاری کو مکمل طور پر اپنے سحر میں جذب کر لیتا ہے۔ اس نے اپنے موضوع پر، سامنے سے نہیں، پہلوؤں سے حملہ کیا ہے ؎

بازی بازی کف نہادند

شوخی شوخی زسر گرفتند

خالص ادبی محاذ پر، یہ کتاب "عسکری مزاح" کے اس "خاندان" سے تعلق رکھتی ہے جس کی تیرِ بہدف مثال، اردو ادب کے جرنل رومیل، کرنل محمد خان کی کتاب "بجنگ آمد" میں نظر آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ "بجنگ آمد" پرائی جنگ کی کہانی ہے اور "ہمہ یاراں دوزخ" اپنی جنگ کی آپ بیتی۔ اور یہ بہت بڑا فرق ہے۔ "شائبہ کیمپ" کا البیلا کپتان، رنگوں سے بھرے ہوئے میلے میں سے گزر رہا تھا۔ مگر "ہمہ یاراں دوزخ" آگ کے دریا میں ڈوب کر گزرنے کی روداد ہے۔ چنانچہ اس کی سطریں، اپنی تمام تر شگفتگی اور ____ اوپر اوپر ٹھنڈی ہوا میں سانس لینے کے باوجود ____ دہکے ہوئے انگاروں پر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں ____

سالک نے جسم کے زخموں سے زیادہ روح کی خراشوں کی نشاندہی کی ہے جو جسم اور ذہن کے تہہ خانوں میں داخل ہوتی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جس نے اس دلچسپ "رپورتاژ" کو ایک دیرپا پرت بھی عطا کر دی ہے۔

"ہمہ یاراں دوزخ" مزاح کی کتاب نہیں مگر ظرافت اس کو سر آنکھوں پر بٹھائے گی ـــــ یہ ادب کی کتاب نہیں مگر اُردو ادب اس کو سینے سے لگائے گا ـــــ یہ تاریخ کی کتاب نہیں مگر تاریخ اس کو نظر انداز نہیں کر سکے گی

صدیق سالک کچھ مدت لیکچرر رہے ہیں مگر وہ ابواب کے خاتمے پر سبق نکال کر دکھانے کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن اس کتاب کا کوئی ورق سبق سے خالی نہیں ہے۔ اور جس سبق پر میرا دل سب سے زیادہ دھڑکا وہ سالک کے الفاظ میں یہ ہے۔

"اگر کسی پاکستانی لیڈر کے بیان سے، پاکستان دشمنی کی بُو آتی تو خون کھولنے لگتا کہ اس ناشکرے انسان کا گریبان پکڑ کر بھرے بازار میں پوچھا جائے ـــــ کیا تجھے آزادی کی قدر نہیں ہے۔ یا کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر یہ ٹکڑا بھی ہم سے چھن گیا۔ تو ہمیں نہ زمین جگہ دے گی نہ آسمان ......"

اور ہاں! کتاب میں الفاظ کے زیر و بم سے ایک "نغمہ خوں گشت" کی آواز بھی تو سنائی دیتی ہے۔

اِدھر مٹا بھی دیا، داغِ قتل ہمک گوہر
اُدھر ابھی کفِ قاتل پہ ہے سرِ مقتول

۵ / اکتوبر ۱۹۷۴ء کو راولپنڈی میں "ہمہ یاراں دوزخ" کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا۔

کتابوں کی شہزادی کتاب

میری ان گذارشات کا مقصود پروین سیّد فنا کے اولین مجموعۂ شعر "حرفِ وفا" کے فنی پہلو کا سرسری سا جائزہ لینا ہے۔ میں عادتاً اور روایتاً لکھنے والوں کے اس زمرے میں شامل ہوں جو قلم کو بندوق کی طرح استعمال کرتے ہیں یعنی جس طرح نشست باندھے بغیر بندوق سے فائر نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح میں تمہید باندھے بغیر مضمون کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ لکھنے کے معاملے میں ہم اس "راست اقدام" کے قائل نہیں ہیں۔ جس کی طرف پروین سیّد فنا نے کچھ اسی طرح اشارہ کیا ہے۔

زخموں کے انبار لگے ہیں　　　　قیمت پوچھو دام چکاؤ

آیئے پہلے کچھ ظاہر کی آنکھ سے کتاب کا تماشا کرلیں۔ انسان اپنے لباس سے بھی تو پہچانا جاتا ہے۔ "حرفِ وفا" کی اشاعت سے خوبصورت شاعری میں بھی اضافہ ہوا ہے اور خوبصورت کتابوں میں بھی۔ مجھے ان کی شاعری کا تعارف اگر بذریعہ تار کروانا پڑے تو میں یہ ایک جملہ لکھوں ــــــ "وفا کے مرثیوں اور انا کے گلابوں کی شاعری" ــــــ (یہاں یہ بات بھی بریکٹ میں بند کرتا چلوں کہ فنا کے ہاں "انا" ــــــ لمبی چونچ والی، خواہ مخواہ ٹھونگیں مارنے والی انا نہیں یہ غیرت اور خودداری کی "جڑواں بہن" ہے۔) اس کتاب کو پڑھنے سے دل میں اور دیکھنے سے آنکھوں میں طراوت آتی ہے اور اتنی برابر طراوت آتی ہے کہ اس کے سرورق کے حسن کو اس کی غزلوں اور نظموں کے حسن سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کتاب کی نگار بندی کی جولانی اپنے اپنے فن کی منفرد شخصیتوں کے ٹیم ورک (TEAM WORK) نے کھلائی ہے۔ سب سے زیادہ حصہ پاکستان کے مایہ ناز مصور صادقین کے موئے قلم کا ہے جنہوں نے سرورق کے تخیلی خاکے

میں پاکیزگی کی عظمت، سادگی کے جلال اور شائستگی کے ایک کلاسیکی سبھاؤ کو خطوط میں روشن کر دیا ہے۔ اس خاکے میں رنگ البتہ مصنفہ کے بڑے نورِ نظر حسن سید نے بھرے ہیں۔ صادقین صاحب سرورق پر رونمائی کر کے واپس نہیں چلے گئے بلکہ پس ورق تک برابر کتاب کے ہمرکاب چلتے ہوئے جا بجا اپنی "چمن در آستین" خطاطی کے دلکش نمونوں سے اوراق کو اوراقِ گل بناتے چلے گئے ہیں۔ جس کتاب کی تزئین و اشاعت میں صادقین، ندیم اور طفیل "متحدہ محاذ" بنالیں اس کتاب کو کتابوں کی شہزادی کہنا کچھ غلط نہ ہوگا۔ موتیوں کی طرح پروئی ہوئی کتاب کو جہاں سے بھی کھولیے ایسا لگتا ہے کہ گویا چھٹی کے وقت لڑکیوں کے کسی کالج کا پھاٹک کھل گیا ہو۔ ناشروں کے کھاتوں اور مصنفوں کے حالاتِ زندگی سے تو یہی لگتا ہے کہ اردو کی ادبی کتابوں اور خاص طور پر شعری تصنیفات کی مانگ نہایت محدود ہے مگر مجھے امید ہے کہ "حرفِ دعا" وسیع مقبولیت حاصل کرے گی کہ اس کو پڑھنے والے بھی خریدینگے اور دیکھنے والے بھی کیونکہ

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

پروین سید کی روزمرہ زندگی فوجی کنبوں کی زندگی کے ماحول میں بسر ہوتی ہے۔ فوجیوں کو پریڈ (PARADE) یا فیلڈ (FIELD) پر تو خیر لوہا اور پتھر ہونا ہی پڑتا ہے۔ لیکن گھروں میں بھی ان کو "بریشم" ہونے کی کچھ زیادہ مہلت نہیں ملتی۔ تاہم کبھی کبھار، روزِ ابر و شب مہتاب میں، فیلڈ مارشل منٹگمری سے کچھ تھوڑی سی "فرلو" مانگ کر ان کے گھروں میں شعر و ادب کی محفلیں بار پالیتی ہیں، دیکھا جائے تو فنونِ لطیفہ پر جتنا حق اِن پُر مشقت اور پُر خطر زندگی بسر کرنے والے جیالوں کا ہے اتنا حق اور کس کا ہو سکتا ہے؟

کوئی بیس برس پہلے کی بات ہے، اردو ادب کے سچے پرستار اور پُرجوش مبلغ اے ڈی اظہر مرحوم جو ان دنوں برطانیہ میں پاکستان ہائی کمیشن کے اکنامکس منسٹر تھے۔ لندن سے راولپنڈی آئے تو وہ ادبی محفلوں کے لیے اتنے ترسے ہوئے تھے کہ جو دوست ملتا اسے کہتے ——— میاں چائے مت پلواؤ ——— روٹی مت کھلاؤ، شعر سناؤ ———

فطرت۔ باقی۔ نذیر شیخ اور یوسف ظفر یہاں ہیں، ان کو بلواؤ" (جناب اے ڈی اظہر اور لندن کا تذکرہ میں نے یہاں اس لیے کیا کہ اظہر صاحب میرے دوست تھے۔ اور لندن دیکھنے کی آج تک حسرت ہے)۔ بہر حال ان کی آمد پر فوج کے ایک سینئر آفیسر نے اپنے گھر پر ایک محفل شعر و سخن اس طرح آراستہ کی کہ دیواروں سے تیر و تبر، تلواریں اور کمانیں بلم اور برچھیاں چمٹی ہوئی تھیں، کارنسوں پر تھری ناٹ تھری کی چھوٹی چھوٹی گولیوں سے لے کر رائی توپوں تک کے بڑے گولوں کے خول چنے ہوئے تھے۔ ایک پوری دیوار پر واٹرلو کی جنگ لڑی جا رہی تھی اور فرش پر سفید براق چاندنی پر مجلس شعر جمی ہوئی تھی۔ پروین سید فنا کو ہم نے پہلی مرتبہ اسی محفل میں سنا۔ وہ اپنے شوہر میجر سید احمد کے ساتھ تشریف لائی تھیں مگر سامعین لڑکیوں کی اُس قطار میں بیٹھی تھیں جن پر گمان ہوتا تھا کہ ہنوز کسی کالج میں زیر تعلیم ہونگی اور اس محفل میں اکابر شعرا سے (بشمول میرے) آٹوگراف لینے کے لیے آئی ہیں۔ مگر وہ تو شاعرہ نکلیں۔ اور اپنی باری پر انہوں نے غزل بلکہ دو تین غزلیں سنائیں "حرفِ وفا" کو پروین سید فنا نے فن کی دہلیز پر پہلا قدم کہا ہے۔ اس وقت وہ فن کی دہلیز ڈھونڈھ رہی تھیں۔ جس طرح کسی وقت ہمارے اس دور کی منفرد شاعرہ محترمہ ادا جعفری ساز ڈھونڈھ رہی تھیں۔ پروین فنا کے سحر آفریں ترنم نے اس وقت ان کے شعر کی بنیادی قدر قیمت کا تو کوئی اندازہ نہ ہونے دیا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ غزل پڑھتے ہوئے اس لڑکی نے اپنے آنچل کو اپنے سر سے ڈھلکنے نہیں دیا تھا۔ اس محدود سی نشست کے بعد بھی، جب اِدھر اُدھر نجی نشستوں یا کھلے مشاعروں میں ان کو سننے کا موقع ملا کچھ عرصے تک عام تاثر بلکہ تعصب یہی رہا کہ ان کا شعر ان کے سحر آفریں ترنم پر اڑا جا رہا ہے لہذا ان کی شاعری مشاعراتی حدود سے بڑھ کر کائناتی حدود میں شاید ہی قدم رکھ سکے۔ مگر رفتہ رفتہ محسوس ہوا کہ وہ اس فن کو سچی لگن سے اپنائے ہوئے تھیں۔ اور اگر شعر کو ہوائی جہاز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو ان کے شعر میں ترنم، تغزل، تفکر اور تجسس کے یکساں پاور والے چار انجن لگے ہوئے

تھے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ احساس بھی بڑھتا چلا گیا کہ ہر چند یہ خاتون شاعری میں صنفِ لطیف کی ذاتی لطافت، عفت، فکر، پاکیزگی، احساس اور سلیقے کا وہ جوہرِ خاص تو لائی ہے جو دوپٹے کے کسی کونے پر چمکی ٹکا کر پورے دوپٹے کو کہکشاں بنا دیتا ہے مگر شاعری میں اپنے ساتھ باورچی خانہ اٹھا کر نہیں لے آئیں۔ وہ ان شاعرات میں نہیں ہیں جو اُردو ادب کے مینا بازار ہی میں اپنا سٹال لگا سکتی ہوں۔ یا ادب کی کھلی نمائش میں گوشہ خواتین سے ورے ان کی جگہ متعین نہ کی جا سکے۔ بعض معلوم و معروف وجوہ کی بدولت شاعری پر بحیثیت مجموعی مردوں کی "مناپلی" (MONOPOLY.) چلی آئی ہے۔ موجودہ دور میں جن شاعرات نے مردوں کی "مناپلی" کو توڑا ہے ان میں پروین سید فنا کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اور ایسی شاعرات کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے وہ اُردو ادب کی پرہجوم انار کلی یا الفنسٹن سٹریٹ میں "پروٹوکول" کے کسی حلقے کے بغیر، ادیبوں اور شاعروں کے دوش بدوش چل رہی ہیں اور گذشتہ بیس برس کے دوران اپنی فکری اہمیت اور فنی ریاضت کے سبب اب وہ اس مقام پر پہنچ گئی ہیں جہاں ادب کے "مچان نشینوں" کے نزدیک ان کا شعر توجہ کا تو مستحق ہے مگر کسی رعایت کا ہرگز مستحق نہیں۔ ؎

یہ میری انا کا فیصلہ ہے
میں اپنی صلیب خود اٹھاؤں

ادب میں مواد اور ہیئت کی بحث اتنی پرانی اور پیچیدہ ہو چکی ہے کہ ادیبوں کے بجائے اب یہ مسئلہ سائنسدانوں کو حل کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک یہ روح اور پیراہن کا مسئلہ ہے۔ فضیلت بیشک روح کو حاصل سہی مگر یہ کچھ لفظی سی فضیلت ہے کہ پیرہن کی بُنت کٹ (CUT.) تراش اور طراز کی کافر ماجرائی کے بغیر بھی تو بات نہیں بنتی۔ ہمارے اپنے دور میں بعض شعراء کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ انہوں نے روحِ اقبال کو سمیٹ کر چلنا چاہا تو وہی حال ہوا کہ

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

کہتے ہیں حسن دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے ۔ ع نگاہِ شوق کو صحرا بھی دیوانِ غزالی تھا کسی خیال کا نیا پن یا اس میں چونکاہٹ کا عنصر یا کسی فن پارے میں قاری کو اپنا قیدی بنا لینے کی صلاحیت ، ان سب باتوں کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار، بڑی حد تک اسلوبِ اظہار کی سُندرتا اُس کے الھڑپنے یا رکھ رکھاؤ پر ہوتا ہے ۔ عمدہ چائے کی طرح اب یہ "کوملتا" جلتی آنچ سے بھی ترکیب پا جائے کیونکہ اس کا کوئی سکہ بند نسخہ آجتک طے نہیں پا سکا ۔ بقول پروین سید فنا ؎

کھل کے رو لوں تو ذرا جی بہلے
مسکرانا ہی مسرت تو نہیں

پروین سید فنا نظم ، غزل حتیٰ کہ رباعی بھی کہہ لیتی ہیں ۔ ان کے فن پر روایت کی واضح چھاپ نظر آتی ہے ، مگر یہ اس طرح کی روایت نہیں ہے کہ ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

یہ روایت اپنے دامن میں زندگی کی توانائیوں اور سچائیوں کو لے کر چلتی ہے ۔ جس طرح اپنے نظامِ فکر میں وہ تربیت آدم کے حوالے سے امن و انصاف کی قدروں ، اصولوں اور معیاروں کے "گراس روٹ" (GRASS ROOT.) پر قائم رہتے ہوئے زندگی کو سچا اور سُچا بنانے کی سعی کرتی ہیں ۔ اس طرح انکا فن بھی جدید تو ہے ۔ البتہ بدعتی نہیں ہے ۔ غزل میں انہوں نے کلاسیکی سلاست اور سادگی کو اپنے عصر کے سماجی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے ایسی اپج سے برتا ہے کہ ان کا شعر بظاہر اکہرا معلوم ہوتا ہے مگر اکہرا ہوتا نہیں ۔ خیال کے تاثر اور فن کے جمال پر وہ لفظوں کا بوجھ نہیں پڑنے دیتیں ۔ چند مثالیں دیکھئے ؎

اب تو سچ بولنے کی رسم نہیں   کس نے پھر اہتمام دار کیا

تیری پہچان کے لاکھوں انداز — سر جھکانا ہی عبادت تو نہیں
تجھ سے بیگانے کا غم ہے ورنہ — مجھ کو خود اپنی ضرورت تو نہیں

کم نگاہی بھی ردا تھی شاید — آنکھ پابندِ حیا تھی شاید
ہمسفر تھے تو وہ بچھڑے کیوں تھے — اپنی منزل ہی جدا تھی شاید

مت رو خزاں نصیب پتّو — اک سلسلۂ بہار بھی ہے

مرنے والو! مر بھی جاؤ — جینے والو! جشن مناؤ

دِل میں تنہائی کا سناٹا ہے — ایک ویران مکاں ہو جیسے

وہ ایمائیت کی قائل ہیں مگر اظہار فن کارانہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں پانی کا ہوا ہو جانا تو باور آتا ہے مگر وہ پانی کو "اودبلاؤ" نہیں بننے دیتیں ؎

سر سے آنچل تو نہ ڈھلکا تھا کبھی
ہاں بہت تیز ہوا تھی شاید

پھر سے کہہ دے کہ تری منزلِ شوق
میرا دِل ہے مری صورت تو نہیں

وقت گزرا کہ قیامت گذری
کوئی سیلاب رواں ہو جیسے

سمی حسینؑ ابن علیؓ کی بیٹی روشنی تقسیم کرنے کے عمل میں بخل سے کیسے کام لے سکتی تھی اور اظہار میں بھلا کوئی عجز کیونکر مانع ہوتا۔ فن کے جمالیاتی تقاضوں کو وہ بڑی جگر کاری سے پورا کرتی ہیں، چنانچہ ان کا شعر غزل ایک گنگناتا ہوا حسن پارہ یقیناً ہوتا ہے مثلاً

جانے دشتِ آگہی تھا یا بیابانِ جنوں!
ریت کے ذرّوں میں ہم شمس و قمر دیکھا کئے

بادلوں کی نرم رِم جِھم سے یہ کیا بجلی گری
کیا بنایا تھا نشیمن ہم نے اس دن کے لیے

ان کا ایک اور شعر ہے ؎

فنا سے بھی نہ دریا ہو سکا طے
کہ اس کے پاس بھی کچا گھڑا تھا

جہاں تک "حرفِ دفا" کے جمالِ فن اور سطحِ فن کا تعلق ہے وہ نہایت محکم مضبوط گھڑا رکھتی ہیں اور اگرچہ بعض پُر شور مقامات پہ زیر و بم کا کچھ احساس ہوتا ہے اور کون ہے جو ہچکولوں کے بغیر فن کے دریا کو عبور کر سکا ہو لیکن مجموعی طور پر اتنی ضخامت کے مجموعے میں فنی خوبصورتیوں کی جو بلند اور لطیف سطح اوّل سے آخر تک برقرار نظر آتی ہے۔ وہ ان کی شاداب اور دلپذیر قادر الکلامی کا بیّن ثبوت ہے۔ ان کا شعر تندرست ہوتا ہے اور خوبصورتی تندرستی ہی کا نام ہے۔ ان کے کئی شعر تو "ملٹری اکیڈمی کے کمیشن یافتہ" معلوم ہوتے ہیں اور بریگیڈیر سید احمد کی کراس بیلٹ کی طرح کسے اور چمکتے رہتے ہیں۔

نظم میں بھی ان کے ہاں اظہار کی ایک ایسی سیدھی اور سچی مٹھاس اور بے ساختہ نغمگی رچی ہوئی ہے جس نے "حرفِ دفا" کو فن کی ایک ایسی کھری فصل بنا دیا ہے کہ اس کی "ہر ستھری" کرنوں کی طرح جھلکتی اور سونے کی طرح چمکتی ہے۔

"حرفِ وفا" میں بہت سی آزاد نظمیں شامل ہیں۔ آزاد نظم ابھی تجرباتی دور سے گزر رہی ہے اور کچھ عجب نہیں کہ یہ ہر دور میں تجرباتی دور سے گزرتی رہے جو اپنی جگہ پر ندرت و نمو کے اعتبار سے خیر و برکت کی علامت ہے لیکن تجربات دریاؤں کی طرح اپنے ساتھ مٹی بھی لاتے ہیں سو اس رَو میں بعض لوگ مواد کو ملبے کی صورت میں اس طرح اچھالتے ہیں کہ قاری بھی ملبے میں لت پت ہو جاتا ہے۔ زبان کو پتلا کرتے ہیں۔ تو اب آپ بے شک شعر کے ذریعے سے برتن منجھوالیجیے یا آلو پیاز خرید لائیے۔ مگر جناب کیا مجال کہ شعر کے ساتھ کہیں آپ کا دل بھی ذرا سا دھڑک اٹھے یا روح میں روشنی یا رنگ کی کوئی کرن چمک جائے۔ سراغ زندگی پانے کے لیے من میں ڈوبنے کی سعی کرتے ہیں تو کسی تالاب میں جا کر ڈوب جاتے ہیں۔ ع جو یقیں تھا وہ گماں ہو جیسے

پروین سید فنا کے ہاں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انھوں نے اپنی نظم آزاد میں آہنگ و نغمگی کا ایسا التزام رکھا ہے جس سے شعر کی خاندانی نجابت پر بھی آنچ نہیں آنے پاتی نہ ابلاغ کا دم گھٹتا ہے اور نہ اظہار کا قافیہ تنگ ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

جگمگاتے ہوئے خوابوں کے جزیرے میں رواں تھی وہ رات
مسکراتی ہوئی!
شرماتی ہوئی!
جیسے باہوں کو سمیٹے ہوئے دوشیزہ کھڑی ہو کوئی (نظم ۶ ستمبر ۱۹۶۴ء سے اقتباس)

ایک دوسری نظم "عہدِ نو" میں ہیئت اور آہنگ کا ایک تجربہ ملاحظہ ہو۔

ذرا پھر تم قسم کھا کے کہہ دو
اگر یہ زمیں ـــــ یہ تمہاری زمیں
تم سے اپنی بقا کے لیے
اپنی نگیں قبا کے لیے

پھر سے مانگے ہو ——— تو کہو
جان دو گے !
لڑو گے !
مرو گے !
خدا کی قسم سوچ لو
جان لو !
اپنا اچھا بُرا خود ہی پہچان لو
پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی
پھر نہ کہنا کسی نے گواہی نہ دی
پھر نہ کہنا فقط ایک انسان کا فیصلہ
پوری ملّت کی تقدیر بنا رہا !

میرے خیال میں ان کی آزاد نظمیں جن میں "استفسار" "سہاگن" محافظ "حرفِ دفا" اور "نفیشن پریڈ" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ نظمِ آزاد کے قبول و فروغ میں بعض خوشگوار اور دقیع جہتوں کا اضافہ کریں گی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں "حرفِ دفا" میں فنی روایت کا تسلسل ملتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ بلکہ اس کے باوجود، یہ ایک چونکا دینے والی کتاب بھی ہے جس میں قدم قدم پر تازگی اور انفرادیت کے جھرمٹ آباد ہیں۔ پروین سید فنا کی انفرادیت خیال و معنی کی سکندری و قلندری سے بھی عبارت ہے اور اسکے متوازن مترنم اور فنکارانہ اسلوبِ اظہار سے بھی قدرت نے انکو ایک ایسا جوہر بھی عطا کر رکھا ہے جو عورت ذات میں بالعموم اور مرد شعرا میں بالخصوص بہت کم پایا جاتا ہے وہ ہے توازن کے ساتھ اختصار کا ملکہ ان کی چھوٹی چھوٹی نظموں کے متنوع ——— پیلے پیلے، نیلے نیلے، اودے اودے عنوانات دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے اعلیٰ ملبوسات کی کسی بڑی دوکان میں رنگا رنگ ریشمی کٹ پیس (CUT PIECE.) بکھرے پڑے ہوں۔ پروین سید فنا تاثر آفرینی کے اس (SHORT CUT.) سے بخوبی واقف ہیں کہ بات کہاں سے

شروع کرنی چاہیے؟ کس طرح کرنی چاہیے اور کہاں ختم کرنی چاہیے؟ یہی وجہ ہے کہ ان کی چار چار چھ چھ لائنوں کی "کیپسول" قسم کی نظمیں بھی بے پناہ تاثر چھوڑتی ہیں اور پھر ان کی انفرادیت کا راز اس جرات میں بھی مضمر ہے جو ان کی کتاب میں ہی نہیں انکی زندگی میں بھی ملتی ہے ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران ہمارے عزیز دوست عکسی مفتی نے جو ان دنوں پاکستان نیشنل سینٹر سے وابستہ تھے فن کاروں کے ایک جلوس کا اہتمام کیا صورت یہ تھی کہ چند شاعروں اور موسیقاروں کو طبلے اور ہارمونیم سمیت ایک ٹرک کی چھت پر بٹھا دیا گیا۔ یہ ٹرک دن بھر راولپنڈی شہر کے کوچہ و بازار میں گھومتا پھرا۔ اور شعرا اور موسیقار اپنے شعروں اور نغموں سے عوام کے دلوں کو گرماتے رہے۔ ان فنکاروں میں پروین سید فنا بھی شامل تھیں۔ مجھے یاد ہے۔ جلوس جب گارڈن کالج پہنچا تو ہزارہا طلبا کا ریلا ٹرک کے اردگرد امنڈ آیا۔ اوپر سے ابھی ابھی بھارتی طیارے چھپٹتے ہوئے گزرے تھے۔ فضا میں ہماری طیارہ شکن توپوں کی دھائیں دھائیں گونج رہی تھی۔ اور اس گونج اور اللہ اکبر کے نعروں کی صداؤں کے درمیان پروین سید فنا کی آواز بھی گونج رہی تھی۔

میرے پیارے وطن کے محافظ!

ہر قدم پہ خدا تیرا حافظ!

تیرے دامن کو پھولوں سے بھر دوں

اپنا دل، اپنی جان، اپنی خوشیاں

تیری ہمت پہ قربان کر دوں

میرے پیارے وطن کے محافظ! ہر قدم پہ خدا تیرا حافظ!

ان نغموں کی سرزمین سے حبِ وطن کا سوتا اور دیس کی مٹی کی خوشبو بار بار جھلکتی ہے پروین سید فنا نے وطن کی تاریخی آزمائش کے موڑ پر اپنے آنچل کا پرچم بنا لیا تھا مگر تیز ہواؤں کے باوجود اس روز بھی ان کا آنچل ان کے سر سے ڈھلکنے نہیں پایا تھا۔ یہی رویہ انکا اپنے فن کی طرف ہے، وہ اپنے فن کے آنچل کو کبھی ڈھلکنے نہیں دیتیں، ہوا خواہ کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو۔ (حرفِ وفا" کی تعارفی تقریب منعقدہ اسلام آباد میں پڑھا گیا)

اُردو ادب کا مواصلاتی سیارہ

اُردو کے جواں سال شاعر اور ہمارے خوش گفتار دوست جناب جمیل یوسف ہمسائے کی املاک کی بجائے اس کے اخلاق پر نظر رکھتے ہیں۔ اور دشمنوں کی بجائے دوستوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔

سلطان رشک کے اعزاز میں آج کی تقریب جمیل انہی کی سعی جمیل کا ثمر ہے۔

انہوں نے مجھے اس تقریب کی اطلاع جس میں مضمون لکھنے کی بھی فرمائش شامل تھی۔ ٹیلی فون پر دینا چاہی تھی۔ ع

مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی وہ نہ تھے کبھی ہم نہ تھے :

آخر کار جب یہ بشارت ملی تو تقریب اتنی "عنقریب" آ چکی تھی کہ ہمارے لئے سلطان کو دستک دینا بھی مشکل ہو گیا۔ مشکل دو طرفہ تھی۔ سلطان کی خرابی یہ ہے کہ اس نے عمر کم اور زندگی زیادہ گذاری ہے۔ سویا کم ہے۔ جاگا زیادہ ہے۔

ہماری مشکل یہ تھی۔ کہ ہم اس کو بھل سے نہیں جرجہ سے جانتے ہیں۔

وہ سلطان سے سلطانِ عالم۔

سلطان عالم سے سلطان رشک اور سلطان رشک سے قابل رشک ہمارے

سامنے بنا ہے۔

سلطان رشک کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ ادبی حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں۔ ایک رسمی سی بات ہوگی۔ وہ تو بذاتِ خود نشریات کا ایک ایسا مواصلاتی سیارہ ہے کہ دوسرے لوگ اس کے رابطے سے تعارف و توقیر حاصل کرتے ہیں۔ اپنے ایک شعر میں اس نے اپنے چال چلن کے بارے میں کچھ یوں وضاحت کی ہے۔ ؎

صبا صفت ہوں ہمیشہ سفر میں رہتا ہوں
ہر اک مقام ہر اک رہگزر میں رہتا ہوں

وہ ہر مقام اور ہر رہگزر پہ تو نہ رہتا ہے۔ اور نہ رہ سکتا ہے۔ کہ ابتداً جس گلی میں رہتا تھا۔ اب وہاں بھی نہیں رہتا۔

البتہ روزمرہ کی زندگی میں شہر کے چھ۔ سات مختلف مقامات پر ضرور رہتا ہے۔ جہاں وہ مختلف و متضاد، مزاج، مفاد۔ معیار۔ اور مضمون کے لوگوں کے درمیان بظاہر ایسی خوش دلی کے ساتھ رہتا ہے۔ جیسے مچھلی پانی میں۔ اسی غزل میں اس کا دوسرا شعر ہے ؎

میں ابر و باد سے طوفاں سے سب سے ڈرتا ہوں
غریبِ شہر ہوں کاغذ کے گھر میں رہتا ہوں

وہ نہ غریب ہے۔ اور نہ کاغذ کے گھر میں رہتا ہے۔ کہ امیر لوگ کاغذ کے نہیں شیشے کے گھر میں رہتے ہیں۔ البتہ لوگوں کے دلوں میں اس نے ضرور گھر کر رکھا ہے میں سوچتا ہوں کہ اگر سلطان کے محبوں، مداحوں، معاصرین اور متاثرین کا عشرِ عشیر بھی اس تقریب میں پہنچ گیا۔ تو پاکستان نیشنل سنٹر کا ایوان کشادہ بھی تنگ ہو جائے گا۔

اس تقریب کی ایک اور خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ سلطان رشک کی شاعری۔ جوشِ نمو کے لحاظ سے آغازِ بہار کے موسم سے گذر رہی ہے۔

جمیل یوسف نے کمال خیال انگیزی سے اس تقریب کا اہتمام بھی موسم بہار کے آغاز میں کیا ہے۔ توقع رکھنی چاہیئے۔ کہ سلطان رشک کی شاعری کے حوالے سے کچھ اندازہ اس بات کا بھی ہو جائے گا۔ کہ

فصلِ بہار کے آتے آتے کتنے دامن چاک ہوئے۔

کچھ پہلے میں نے سلطان کی روزمرہ زندگی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

سلطان ایک تجارت پیشہ خاندان کا "چٹا بٹا" یعنی چشم و چراغ ہے۔ اس کا پہلا پڑاؤ اندرون شہر کے مصروف ترین تجارتی مرکز المتخلص بہ رنگکاری بازار میں ہوتا ہے۔ جو اس قدر گنجان اور تنگ ہے کہ اس میں شاعری کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اس کا دوسرا پہر لیاقت روڈ پہ واقع ایک دوسرے کاروباری ادارے میں گزرتا ہے۔ تیسرے پہر وہ تیسری جگہ کالج روڈ پر نیرنگِ خیال کے بالاخانے میں "ادب کا دفتر لگاتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ خاصی دیر تک تجارت اور ترازو کے ہاتھ سے نکل کر قلم اور قرطاس کی صحبت میں ڈٹا رہتا ہے۔ اس کی اکثر شامیں کسی باقاعدہ ادبی تقریب یا ادیبوں کے بے قاعدہ جھرمٹ میں گذرتی ہیں۔ تاجر ہونے کے باوجود اس کو یہ بات معلوم ہے کہ روپیہ صحت نہیں خرید سکتا چنانچہ رات کے کسی پہر میں جب سارا عالم سوتا ہے۔ وہ ایک کلب میں جا کر بیڈمنٹن کھیلتا ہے۔

اور بازی کچھ اس طرح سر دھڑ کی بازی لگا کر کھیلتا ہے جیسے تجارت تو تجارت ہے۔ وہ صحت کو محبت سے بھی مقدم رکھتا ہے۔

اس کے بعد شاعری اور بچوں کے لئے اس کے پاس صرف "جمائیاں" رہ جاتی ہیں۔ وہ ان دونوں کو جمائی اور سینے سے لگائے آٹھوں پہر ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے۔

چنانچہ اس کا بڑا بیٹا فیصل جو اب ماشاءاللہ چھ برس کا ہو چکا ہے۔ باپ کی شاعری اور باپ کے دوستوں سے یکساں طور پہ بور ہو چکا ہے۔

میں ایک مرتبہ اس کے سامنے مسٹر مشتاق احمد چاندنہ دہلوی کا نام لے کر عزیزم کا ردعمل سن چکا ہوں۔ البتہ یہ خوشی کی بات ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی گھریلو مشقتوں کے باعث سلطان کی مجموعی گھریلو زندگی بڑی ستواں نظر آتی ہے۔ ورنہ شادی کے بعد اکثر مرد مشتبہ ہو جاتے ہیں۔

سلطان کے بیڈمنٹن کلب کو معروف تاجروں اور سوداگروں کا "حلقہ ارباب چرک" کہنا چاہیئے۔ یہ کلب بازار بند ہونے کے بعد کھلتا ہے۔

کھلاڑی پہلے نماز عشاء ادا کرتے ہیں۔ اور پھر رات کے پچھلے پہر دعوت ولیمہ کی طرح کئی گھنٹے تک لقمہ بہ لقمہ کھیل جاری رہتا ہے۔ اس کلب کے اکثر ممبروں کے لئے کھیل لہو نہیں۔ شکم گرم رکھنے کا بہانہ ہے۔

ایک صاحب جو ایک بڑے سوداگر جرم بتلائے جاتے ہیں۔ ایک گیم کھیلتے ہیں تو دو مرتبہ وقفہ تناول ڈال کر حلوہ گاجر تناول فرماتے ہیں۔ ع

گر جیت گئے تو کیا کہنے ہارے بھی تو بازی مات نہیں

سلطان رشک اپنے جملہ ہیوی ویٹ معاصرین میں سب سے زیادہ چابک دست اور پھرتیلا کھلاڑی ہے۔ رات کے بارہ بجے وہ اسی کلب میں ملتا ہے۔

راولپنڈی کے ارباب ادب کو اس بات کا علم ہے کہ جب عبدالعزیز فطرت زندہ تھے تو شہر میں ان کا گھر ادیبوں کی ۔ ادب سرائے ۔ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے بعد رفتہ رفتہ اس زندہ و تابندہ ریل پیل کا رخ "نیرنگ خیال" کے بالاخانے کی طرف ہوتا چلا گیا۔

منفرد مزاح گو شاعر نذیر احمد شیخ مرحوم دفتر نیرنگ خیال کو "دار التصنیفات کے بجائے دار التشریفات" کہا کرتے تھے۔ آپ اگر کبھی وہاں تشریف لے گئے ہیں تو آپ وہاں کتابوں سے زیادہ بستر دیکھیں گے۔ کتاب بند بستر کھلا۔ کمرے کا دروازہ

کھلنے پر یوں لگتا ہے جیسے کوئی دفتر نہیں بستر کھل گیا ہے۔ جس میں تکیے کی بجائے نیرنگ خیال کے غزل اور جوبلی نمبر استعمال کئے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ سید عبدالحمید عدم ایک رات یہاں ٹھہرے۔ تو جاتے ہوئے یہ مصرعہ لکھ کر سلطان کو دے گئے ؎

جن پہ بستر تھا۔ وہی تکیے ہوا دینے لگے۔

تجارت نہیں سلطان رشک مہمان داری بھی ٹھوک کے حساب سے کرتا ہے۔

مہمان داری دفتر نیرنگ خیال کی پرانی ریت ہے۔ لاہور میں قبلہ حکیم محمد یوسف حسن صاحب کا دفتر خواہ فلیمنگ روڈ پر تھا۔ یا بارود خانہ میں ہمیشہ ادیبوں کا مسافر خانہ رہا۔ مجھے یاد ہے کہ جن دنوں ہم اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ تو جب کبھی ہم خان بہادر عبدالرحمان چغتائی، پروفیسر سید احمد شاہ بخاری، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، پنڈت ہری چند اختر سید امتیاز علی تاج، ابوالاثر حفیظ جالندھری، صوفی تبسم۔ مولانا چراغ حسن حسرت۔ سید عابد علی عابد۔ یا کسی دوسرے نامور ادیب و شاعر کی صورت دیکھنا چاہتے تو فلیمنگ روڈ پر۔ نیرنگ خیال کے دفتر کے سامنے جا کر گنڈیریاں چوسنے لگتے۔ اور بعض اوقات ہم یہ دیکھ کر حیران بلکہ آزردہ ہو گئے کہ ہمارے یہ اکابرین ادب بھی اندر گنڈیریاں ہی چوستے پائے جاتے۔ سچ ہے بڑے مصنفین کو ان کی کتابوں ہی میں دیکھنا چاہیئے۔

بے ملاوٹ خوشی کا زمانہ۔ جاتے ہوئے بچپن اور آتی ہوئی جوانی تک محدود ہوتا ہے اٹھتی ہوئی جوانی کا اپنا چہرا خواہ بیٹھا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔ زندگی کا چہرہ کتابی اور رنگ شہابی ہوتا ہے۔ ہونٹ بند ہوں تو غنچہ۔ کھلیں تو کھل کر پھول۔

سلطان رشک سے جب ہماری ملاقات ہوئی تو وہ اپنی عمر کے اسی آریائی دور کی برس ملائی سے گذر رہا تھا۔ آرزوؤں کی روشنی ابھی تازہ تازہ اس کی زندگی کے آنگن میں اتری تھی۔ جیسے ایشیا میں سورج کی کرنیں سب سے پہلے جاپان کی زمین پر اترتی

ہیں۔ وہ اس وقت گارڈن کالج کے ثقافتی غزالوں کا سرخیل تھا۔ جن کی چہل پہل سے گارڈن کالج باغ باغ رہتا ہے۔

مشہور و ممتاز ادیبوں کے ساتھ شام منانا سلطان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ادبی شاموں کی ہمہ ہمی نے ان دنوں کالج کی ہر شام کو "شام چوراسی" بنا رکھا تھا۔ خود ہماری شہرت بھی اسی کی دوڑ دھوپ سے کالج کی ایک شام میں روشن ہوئی تھی۔

ادبی شاموں کا سودا اتنا نقد نہ سہی کہ ایک ہاتھ سے دو اور دوسرے ہاتھ سے وصول کر لو۔

ادھار بہر حال ادھار ہے ایک روز چکانا ہی پڑتا ہے۔

ہم سب ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ ٹیکس ضرور وصول کرتے ہیں۔

سلطان ایک ایسے تجارت پیشہ خاندان میں پیدا ہوا ہے جو اپنی معلوم تاریخ میں تجارت اور عبادت کے علاوہ کوئی اور کام کر ہی نہیں سکا۔ ادب کی بس اتنی سی روایت سلطان کو ورثے میں ملی کہ ان کے والد روٹی کا ناغہ کر لیتے تھے۔ مگر اخبار کا ناغہ نہیں کرتے تھے۔

سلطان پانچ بھائیوں میں چوتھا بھائی ہے تعلیم میں پہلے نمبر پہ تجارت میں چوتھے نمبر پہ۔ یہ بڑے بھائیوں کے سامنے "سرِ تعظیم اور بڑے بھائی اس کے سامنے سرِ تعلیم" خم کئے رکھتے ہیں۔ ان کے بزرگ زرداری تو تھے نہ ناداری نہ تھے۔ دولت آئی رعونت نہیں آئی۔ وہ قانع ہیں۔ مگر مطمئن نہیں۔ پیدائش دہلی میں افزائش پنجاب میں۔ حکومت مغلوں کے ہاتھ میں تجارت ان کی گرفت میں۔ لال قلعہ ان کا اور چاندنی چوک ان کا۔ سلطان کے بڑے بھائی سردارِ خاندان۔

جناب سردار عالم صاحب سے مل کر مجھے ہمیشہ محسوس ہوا کہ آدمی "کالا کولا" بیچ کر بھی شفاف رہ سکتا ہے۔ اور یہ کہ جس آدمی کے دل میں خوفِ خدا ہوتا ہے دولت

اس کی خادم ہوتی ہے۔ آقا نہیں بن پاتی دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔

قیام پاکستان پر جب یہ خاندان اکھڑ کر گوجر خان میں وارد ہوا تو دولت کی چھاؤں ڈھل رہ گئی۔ اللہ کی آس اور ہمت کی اساس کے سوا ان کے پاس کوئی پونجی نہ تھی۔ اس متاع سے کیا روزگار کیا بقول سید ذوالفقار علی بخاری ؎

ہم ہوئے جو کچھ یہیں رہ کر ہوئے

انسان کی سب سے بڑی قوت اس کا ارادہ ہے۔ سلطان نے اس قوت سے بڑا کام لیا ہے۔ وہ بی۔ اے۔ ایم۔ اے کے امتحان محض اپنی قوت ارادی کا امتحان لینے کے لئے پاس کرتا چلا گیا۔ ورنہ جہاں تک اس کے آبائی کاروبار کا تعلق تھا۔ وہ تعلیم سے نہیں تفہیم سے چلتا ہے۔ اس کے لئے پڑھنے سے زیادہ گرھنا ضروری ہے۔

اس کی قوت ارادہ اور ترجیحات کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اس نے ایک تاجر اور ایک شاعر کو اپنی ذات میں اس طرح شیر و شکر کر رکھا ہے کہ دونوں میں کوئی بھی بھوکا مرنے نہیں پاتا۔

بیک وقت کئی تجارتی منصوبوں میں اس کی ٹانگ اور کئی ادبی منصوبوں میں اس کا قلم پھنسا رہتا ہے۔ کعبہ پیچھے پیچھے۔ کلیسا آگے آگے مختلف کاروباری ہیڈ کوارٹروں میں چار چھ ٹیلی فون اس کی تلاش اور تعاقب میں شب و روز بجتے رہتے ہیں۔ وہ خود بھی ٹیلی فون سے دور رہنا پسند نہیں کرتا۔ کہ ٹیلی فون کے بغیر تجارت غارت ہو جاتی ہے ورنہ عبدالعزیز خالد کی طرح ٹیلی فون اٹھوا کر باورچی خانے میں رکھوا دے۔ روح کے لحاظ سے وہ دراصل تجارت کا آدمی نہیں عبارت کا آدمی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ دکان پر ایک اظہر جاوید کا خیر مقدم کرنے کے لئے دس گاہکوں کو خالی لوٹا دیتا ہے۔

تجارت کے ذریعے اس نے اپنی محنت سے کمائے ہوئے سکھ کے ساتھ ادب کی

شکل میں ایک رضا کارانہ دُکھ اپنی جان کو لگا رکھا ہے۔

اس کے گودام میں مینڈورا آف لنڈن لنڈورا پڑا رہتا ہے۔ مگر نیرنگ خیال کے پرچے سلیقے سے چُنے رہتے ہیں۔ ادب سے لگاؤ سے ایک اور مثال دیکھئے کچھ عرصہ ہوا۔ کاروبار کے ایک مرحلے پر جب کسی شخص کے ساتھ شراکت کا مسئلہ پیدا ہوا تو سلطان نے اس کارخش میں کرنل محمد خان جیسے ممتاز ادیب کو منتخب کیا۔ تاکہ ترقی کا راستہ کچھ تو ہموار ہو سکے۔ اور یہ دونوں دوست کاروبار کے طرزِ نگارش کے ہر پہلو میں اتنے غیر متزلزل طور پہ متنفق الرائے ہیں۔ کہ ان میں سے ایک پارٹنر فالتو معلوم ہوتا ہے۔

اکبر الہ آبادی نے کہا تھا کہ ۔ع

دیکھ لو تاجر کے سر پہ تاج ہے۔

سلطان رشک تاجر کے تاج کے لئے بے شک دن بھر دونوں ہاتھوں سے موتی سمیٹتا رہے۔ مگر شام کو دفتر نیرنگ خیال میں جا کر تاجر کے تاج کو شاعر کے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔ میں نے ایسا ساہوکار آج تک نہیں دیکھا۔ جس کی عادتیں مہاجنوں کا دوالہ اور مہاجنیت کا جنازہ نکالنے والی ہوں۔

ادب ایک ایڈونچر (ADVENCHER) ہے۔ سلطان اگر ٹھیٹھ کاروباری شخص ہوتا تو کبھی اس کا رُخ نہ کرتا۔ انہی معنوں میں وہ عزیب شہر بھی ہے اور کاغذ کے گھر میں بھی رہتا ہے۔

مدیرِ نیرنگِ خیال۔ مال اور خیال دونوں کو ایک تجوری میں رکھتا ہے اس کی لپشت پر اگر رموزِ تجارت کے نکتہ رس بھائی نہ ہوتے اور خود بھائیوں کے پیچھے دہلی کا چاندنی چوک پھیلا ہوا نہ ہوتا تو سلطان رشک نہ تجارت میں سربلند ہوتا اور نہ ادب میں قابلِ رشک۔

ادبی روائتوں کو اگر عمارتوں کے "ڈکشن" میں بیان کرنے کی اجازت ہو تو میں حکیم محمد یوسف حسن کے "نیرنگ خیال" کو۔ لاہور کے تاریخی شاہی قلعے سے تشبیہ دوں گا۔ قلعے کے آثار میں اگر صدیوں کی تاریخ جھلک رہی ہے تو نیرنگ خیال کے اوراقِ پارینہ میں، ادب و تہذیب کی تاریخ محفوظ ہے۔ وہ سنگ و خشت کا قلعہ یہ لفظ و معنی کا شالامار۔ اس کی ادارت کو سنبھالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ ادب و تہذیب کے عظیم الشان شیش محلوں۔ بارہ دریوں اور روشن جھروکوں کے تحفظ کی گراں بار ذمہ داری تھی۔ قلعے کی دیواروں پہ گرد کے علاوہ کہیں کہیں شگاف بھی پڑ چکے تھے۔ گویا مرمت اور رفو کا کام بھی کچھ کم نہ تھا۔ پیش رو کون؟ حکیم محمد یوسف حسن جیسا عہد ساز مدیر۔ مزید برآں، جانشینی کا فریضہ ان کی دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں کے سامنے ادا کرنا۔ بڑی آزمائش کا مرحلہ تھا۔ بلندی پہ جا کر اکثر لوگوں کا سر چکرانے لگتا ہے۔ بڑے آدمی جگہ خالی کریں تو چھوٹے آدمی۔ کرسی پہ تو بے شک بیٹھ جاتے ہیں مگر چھوٹا آدمی محض بڑی کرسی پہ بیٹھ جانے سے تو بڑا آدمی نہیں بن جاتا۔ تا وقتیکہ اس کے اپنے اندر کوئی روشنی موجود نہ ہو۔ انسانی عظمت بھی پکائی روٹی نہیں ہوتی۔ اس بات کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ سلطان رشک نے گذشتہ برسوں میں ادب کے اس قلعے کو نہ صرف یہ کہ دھوپ اور بارش سے محفوظ رکھا ہے بلکہ تولنے میں وزنی اور بولنے میں دقیع خاص شماروں (بالخصوص غزل اور جوبلی نمبروں) کی صورت میں اس کے استر اور پلستر کو بھی نئے رنگ روغن سے اس طرح تازہ کیا ہے کہ اب آپ اس قلعے میں گویا "مال روڈ" کی راہ سے داخل ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سلطان تنہا اس گراں قدر ادبی خدمت کے لئے وابستگانِ شعر و ادب کی طرف سے پذیرائی اور ستائش کا مستحق ہے۔

سلطان رشک، غزلِ جدید کے قابلِ ذکر نوجوان شعراء میں نمایاں مقام رکھتا

ہے۔ اسی باعث تو لوگ اس کے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہیں۔ اور کیسے کیسے لوگ اس کی باتیں سننے آتے ہیں ؛ ع

مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

شاعری میں غزل — سلطان کی پہلی محبت ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مکمل عورت ایک مکمل مرد سے بہتر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکمل عورت بہت کم دستیاب ہوتی ہے یہی عالم غزل کا ہے۔ میرے نزدیک مکمل غزل۔ مکمل نظم سے بہتر ہوتی — چنانچہ مکمل غزل بھی بڑی مشکل سے مکمل ہوتی ہے۔

ادب کے وظائف کی فہرست بڑی طویل ہے۔ مختصراً۔ میرے نزدیک ادب کا فریضہ زندگی کے معنی دریافت کرنا ہے کہ یہ وبال آخر کیا ہے۔ اور کیوں ہے۔ ادب کو انسان کی داخلی آسودگی و بالیدگی کے علاوہ اس کے بعض عجیب خارجی مقاصد کی تشفی کا بھی امین ہونا چاہیئے۔ ادب میں آپ مکان اور محلے — دین اور دُنیا۔ کو علیحدہ علیحدہ نہیں رکھ سکتے۔ ادب کا اصل جادو، فن کار کے اسلوب میں ہوتا ہے۔ ورنہ فن کار اپنے خیالات کا قیدی — اور قاری — اس کا مزدور بن کر رہ جاتے — سلطان رشک کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اذنِ بیداری جو دے وہ آفتاب آیا نہیں
اے شبِ ظلمت ترا روزِ حساب آیا نہیں
رزق کی تقسیم ایسی کیوں ہے اے سلطان رشک
آج تک اس ایک الجھن کا جواب آیا نہیں

رنگ لائی ہے مری ذات سے غفلت میری
میرے اندر متزلزل ہے حکومت میری
بیچتا پھرتا ہوں خود کو سرِ بازارِ حیات
مجھ کو رسوا کئے رکھتی ہے ضرورت میری
وقت ایسا کہ ہر اک قدر کا مفہوم نیا
اور بیگانۂ حالات طبیعت میری

بھولتا جاتا ہوں ذکرِ عارض و رخسار بھی
وقت اس مہتاب صورت پر بھی بیلا آنے نہ دے
اس طرح تعمیر کر اپنی کہ اے سلطان رشک
ایک ذرہ بھی کہیں سے مستعار آنے نہ دے

اپنے چہرے پہ سجا رکھے ہیں غم کے سلسلے
جانے کس کس سے الم کی داستاں کہنا پڑے
ایسی بستی کے مکینوں میں گھرا ہوں میں۔ جہاں
قربۂ دشمن کو ۔ کوئے دوستاں کہنا پڑے

سوچیں تھکی ہوئی ہیں کڑی دھوپ سر پہ ہے
اب کیسے طے کریں کہ کدھر جانا چاہیئے
میری نظر میں ہے یہی معیارِ نقدِ فن !!
سچا ہو فن تو دل میں اتر جانا چاہیئے

تیری میری ابتلا کے ترجمان ہو جائیں گے
چپ رہے بھی ہم تو یہ رستے زباں ہو جائیں گے
سچ کہا ہم نے تو دیوارِ اَنا ۔ گر جائے گی
فاصلے پیدا ۔ دلوں کے درمیاں ہو جائیں گے

سلطان رشک جواں سال ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس کی شاعرانہ شخصیت کی پوری قامت ابھی اس کے فن سے منکشف نہیں ہو پائی ۔ یہ عمل " ادبی اننگز " کے خاتمے تک جاری رہتا ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی درمیان میں اچانک " رن آؤٹ " یا " ایل ۔ بی ۔ ڈبلیو " ہو جائے ۔ میرے نزدیک سلطان رشک ایک جمال دوست اور صاحبِ بصیرت شاعر ہے ۔ جس کا شعر کشمکشِ جاں کے ناپیدا کراں امکانات کی نشاندہی کرتا ہے ۔ وہ پیراہن شعر کی چھب رنگینی اور رعنائی کا اتنا خیال رکھتا ہے کہ اس کے شعر پر اگر خشمگیں نگاہ ڈالی جائے تو شعر ۔ نیمان کی طرح کملا جائے ۔ ارسطو نے تین چیزوں کو دنیا کی بہترین نعمتیں قرار دیا ہے ۔ انصاف ۔ حسن ۔ صداقت ۔

اور یہ تینوں چیزیں سلطان رشک کی شاعری کے محور کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ بالخصوص صداقت کا دامن تو اس نے اتنی مضبوطی کے ساتھ تھاما ہوا ہے کہ اس کے اشعار نلجائز منافع خور اور ذخیرہ اندوز تاجروں کے سروں پہ جا کر پھٹتے ہیں ۔

میں نے سلطان رشک کی شاعری کا ذکر عملاً اختصار سے کیا ہے ۔ کہ میرے سامنے شعر سے زیادہ شخص پھیلا ہوا تھا ۔ شاعری سب کے سامنے ہے شخص سب کے سامنے نہیں ہے ۔

(یکم مارچ ۱۹۸۰ء کو راولپنڈی میں ایک خصوصی تقریب میں پڑھا گیا)

ہر دلعزیز شاعر، نثر نگار، کالم نویس اور بذلہ سنج ضمیرؔ جعفری کو کون نہیں جانتا؟ شاید وہ معدودے چند نہ جانتے ہوں جو جان بوجھ کر کسی کو بھی جاننا نہیں چاہتے۔

تحریر ہو یا تقریر یا کچھ بھی نہ ہو، ہر وقت طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے ہیں لیکن جب کوئی دیکھ نہ رہا ہو تو آنکھ بچا کر چپکے سے سنجیدہ شاعری بھی کر جاتے ہیں۔

ضمیرؔ کے اشعار کیسے ہیں؟ نثر کی کیا خصوصیات ہیں؟ صحافتی تحریروں کا درجہ کیا ہے؟

اگر خوبیاں بیان کرنے لگوں (جو کرنا چاہتا ہوں) تو اپنے فطری انکسار کی وجہ سے شاید ضمیرؔ اسے پسند نہ کریں، اور اگر اُلٹی سیدھی تنقید کرنے کی کوشش کروں (جو بالکل نہیں چاہتا) تو پڑھنے والوں کو اچھی نہیں لگے گی۔ لہٰذا باکسنگ کے ریفری کی طرح یہ کہنا صحیح ہوگا کہ —— اس طرح ضمیرؔ ہیں، اور اس طرف قارئین! SECONDS (یعنی فالتو حضرات) اِدھر اُدھر ہو جائیں، اب آپ جانیں اور ضمیرؔ صاحب!

شفیق الرحمٰن



ابتدا میں ضمیرؔ سے میرے تعلقات محکمانہ تھے۔ ذرا اور قریب آئے تو اُن کے انداز مشفقانہ رنگ اختیار کرنے لگے۔ اب آخری منزل میں ہمارا رشتہ پیری مُریدی کا ہے۔ پیر ضمیرؔ ہیں اور مُرید یہ خاکسار، مگر مُرید سے کہیں زیادہ پیر کا مزاج خاکسارانہ ہے۔

آپ ضمیرؔ کو ایک شاعرِ شیریں مقال کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن ضمیرؔ شاعر ہونے کے علاوہ بہت کچھ اور بھی ہے۔ مثلاً ایک تو یہی کہ وہ پیر ہے لیکن وہ روایتی شیرینی گیر پیر نہیں بلکہ بڑا گنج بخش پیر ہے، وہ دولت لُوٹنے والا پیر نہیں بلکہ دولت لُٹانے والا پیر ہے —— شیریں زبانی کی دولت، میٹھے کلام کی دولت، دیباچہ نویسی کی دولت۔

—ہمیں ضمیرؔ سے پیار ہے تو اُن کی نثر کی وجہ سے۔ ہم سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں نثر کے میدان میں ضمیرؔ یکسر بے نظیر ہے۔ خواتین و حضرات، یہ اتفاق ہے کہ ضمیرؔ کے قریبی دوست تقریباً سب کے سب نثر نگار ہیں۔ انہی میں سے یہ خاکسار بھی ہے۔ لیکن ہم لوگوں کی نثر ضمیرؔ کے مقابلے میں بے آب گیاہ بنجر ہے۔ اُبلا بیابان ہے۔ ایک کھنڈر بھنڈار ہے مگر ضمیرؔ کی نثر؟ شاداب سبزہ زار ہے۔ چمنستان ہے بلکہ ایک مجسم ریشم جان ہے۔ ضمیرؔ کو بچے پڑھیں تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں کوئی جانسن بے بی لوشن مل رہا ہو۔ خواتین کو ضمیرؔ کے نثر پارے نرم اور ملائم لگتے ہیں جیسے شنیل کے تھان پر انگلیاں پھیر رہی ہوں باقی رہے جملہ اہلِ دل، تو وہ تو جہاں ضمیرؔ کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں۔

(کرنل محمد خان)

مکۃ المکرمہ پرنٹنگ پریس